قیمت: پانچ روپے Rs. 5/-

ہندستان کی آزادی کے ۷۵ ویں جشن کے پرمسرّت موقع پر

ہفت روزہ
الجمعیۃ
نئی دہلی

کا

آزادی نمبر

ترتیب و پیشکش
محمد سالم جامعی

جلد: ۳۴
شمارہ: ۳۳
۱۳/تا ۱۹/اگست ۲۰۲۱ء — ۳/تا ۹/محرم الحرام ۱۴۴۳ھ
Year-34 Issue-33 13 - 19 August 2021 Page 16
قیمت پانچ روپے

ضرور پڑھیں

- جدوجہدِ آزادی-۱۸۰۳ء سے ۱۹۴۷ء تک: ایک جائزہ ص۲
- ہندستان کی مسلح افواج میں مسلمان اور ان کے کارنامے ص۴
- آزاد ہندستان میں فارغین مدارس کی اسناد اور ملازمت کا مسئلہ ص۵
- سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ ص۶
- جمعیۃ علماء ہند اور ہندستان چھوڑو تحریک ص۸-۹
- آزاد ہندستان میں نفرت انگیز مہم کا جواب محبت و اخلاق سے دیں ص۱۰
- آزاد ہندستان میں سیاست میں شفافیت کی ضرورت ص۱۲
- مجاہد آزادی اودھم سنگھ جس نے جنرل ڈائر کو کیفر کردار تک پہنچایا ص۱۳

دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کا ملک کی جنگ آزادی میں تاریخی کردار

جدوجہدِ آزادی

۱۸۰۳ء سے ۱۹۴۷ء تک ایک جائزہ

تحریر: حضرت مولانا سیّد ارشد مدنی

جدوجہد آزادی ہی نہیں ملک کی کوئی بھی تاریخ ہندوستان کے علمائے کرام کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی خواہ وہ ملّی یا قومی قیادت وسیادت ہو یا آزادئ وطن کے لیے میدانِ جنگ میں کود پڑنا، کسی تحریک کی قیادت ہو یا پھر کسی مصیبت اور پریشانی کے وقت میں لوگوں کی مدد وغمگساری، ہر میدان میں علماء نے اہم کارنامے انجام دیئے ہیں اور حکومت وقت کے سامنے سینہ سپر ہوکر حق اور سچ بات رکھی ہے۔ ایک بڑی تاریخی سچائی یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک علماء اور مسلمانوں نے شروع کی تھی اور یہاں کے عوام کو غلامی کا احساس اس وقت کرایا جب اس بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں رہا تھا۔ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف سب سے پہلے علم بغاوت علماء نے ہی بلند کیا تھا اور جنگ آزادی کا صور بھی انھوں نے ہی پھونکا تھا۔

ہندوستان کے بے شمار لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ملک کی پہلی آزادی کی لڑائی ۱۸۵۷ء میں لڑی گئی تھی لیکن یہ بات اپنی تاریخ اور اپنے بزرگوں کی قربانیوں سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ آزادی کی تاریخ ۱۸۵۷ء سے نہیں بلکہ ۱۷۹۹ء میں اس وقت شروع ہوئی جب سلطان ٹیپو سلطان نے سرنگا پٹم میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ جس وقت ان کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش پر انگریز فوجی نے کھڑے ہوکر یہ بات کہی تھی ''آج سے ہندوستان ہمارا ہے'' اس کے بعد ہی انگریز یہ کہنے کی ہمت پیدا کرپائے کہ ''اب کوئی طاقت ہمارا مقابلہ کرنے والی اور ہمارے پنجے میں پنجہ ڈالنے والی نہیں ہے'' اور پھر انھوں نے عملی طور پر چھوٹے چھوٹے نوابوں اور راجاؤں کو شکست دے کر ان کو سرتسلیم خم کرنے پر مجبور کردیا۔

ٹیپو سلطان کی شہادت اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کے بعد علمائے کرام نے غلامی کی آہٹ کو محسوس کرلیا تھا اور اس کے بعد سے ہی جہادِ آزادی کا آغاز ہوا۔ جب انگریز نے ۱۸۰۳ء میں دہلی کے اندر یہ اعلان کیا کہ ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا لیکن آج سے حکم ہمارا ہے'' اس دن اس ملک کے سب سے بڑے عالم دین اور خدارسیدہ بزرگ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بڑے بیٹے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ نے دلّی میں یہ فتویٰ دیا کہ:

''آج ہمارا ملک غلام ہوگیا اور اس ملک کو آزاد کرانے کے لیے جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔''

یہ جرأت مندانہ اعلان ایسے وقت میں کیا گیا جب اس عالم دین کے علاوہ ہندوستان کے اندر کوئی ایسا نہیں تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقابلہ میں اپنی زبان سے آزادئ وطن کے لیے جہاد کا اعلان کرسکتا تھا۔

اس فتویٰ کی پاداش میں ان کو بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں، انھیں زہر دے دیا گیا، ان کی جائداد کو قرق کرلیا گیا، ان کی آنکھوں کی بینائی اس زہر سے جاتی رہی، ان کو دلّی شہر سے دربدر کردیا گیا، ان تمام سخت ترین حالات میں بھی انھوں نے اپنی موت سے پہلے دو روحانی شاگرد پیدا کردیئے، ایک حضرت سیّد احمد شہید رائے بریلویؒ اور دوسرے حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ، ان لوگوں نے پورے ملک کے دورے کیے اور مسلمانوں سے جہاد کی بیعت اور اس کا عہد لیا کہ وہ ہمارے ساتھ ملک کی آزادی کے لیے اپنی جان قربان کردیں گے۔ اس کے بعد بالاکوٹ کے میدان میں ہزاروں مسلمان ان دونوں صاحبان کے ساتھ سب سے پہلی آزادئ وطن کی جنگ میں شہید ہوئے۔ یہ سب سے پہلا آزادئ وطن کے لیے جہاد تھا جو دوسرے جہادِ آزادی ۱۸۵۷ء کا مقدمہ تھا۔ جو لوگ وہاں اس وقت ناکامی کے بعد واپس ہوئے ان لوگوں نے واپس آکر پھر اکائیوں کو جمع کیا اور افراد کو تیار کیا اور چھبیس سال کی محنت کے بعد ۱۸۵۷ء میں دوبارہ آزادئ وطن کے لیے جہاد شروع ہوا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوئے لیکن مسلمان زیادہ تھے اور ہندو کم تھے۔ آزادئ وطن کے لیے یہ دوسرا جہاد بھی ناکام ہوا۔ اس جہاد کی پاداش میں علماء کو گرفتار بھی کیا گیا اور کچھ علماء نے اپنے آپ کو نظربند کرلیا۔ جب یہ علماء تین چار سال کے بعد جیل سے باہر نکلے اور عام معافی کا اعلان ہوا تو انھوں نے بڑی عجیب وغریب چیز دیکھی کہ وہ یتیم جن کے باپ جامِ شہادت نوش کرگئے، انگریز کی دشمنی کی وجہ سے ان کے یتیم بچے سڑکوں پر ہیں، ان کے سر پر کوئی ہاتھ رکھنے والا نہیں ہے۔ ان حالات کا فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے فکری محاذ پر بھی اپنی لڑائی تیز کردی۔ چنانچہ کرسچن اسکول، عیسائی پوپ اور چرچ کے لوگ باہر نکل کر ان یتیموں کا ہاتھ پکڑتے اور کہتے کہ ہمارے ساتھ چلو ہم تم کو کھانا، رہائش اور تعلیم مفت دیں گے۔ مقصد ذہنی اعتبار سے ان کو انگریز بنانا تھا۔ یہ وہ بچے تھے، جن کے آباء واجداد نے انگریز دشمنی میں جہادِ آزادی میں جامِ شہادت نوش کیا لیکن اب انھیں کی اولاد انگریزوں کے ہاتھ میں تھی اور وہ ان کو فکری اعتبار سے اپنا غلام بنانا چاہتے تھے۔ ان حالات کو دیکھ کر علمائے کرام سر جوڑ کر بیٹھے اور فیصلہ لیا کہ دو جہادوں میں مجاہدین شہید کردیئے گئے، اب ہمیں آزادئ وطن کے لیے ایسی فیکٹری کی ضرورت ہے جہاں اپنے ملک ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے مجاہدین تیار کیے جائیں، چنانچہ مکمل سات سال کے بعد ۱۸۶۶ء میں انھوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی اور بالکل وہی نعرہ دیا کہ ہم بچوں کو مفت کھانا اور رہائش کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم سے آراستہ کریں گے اور ان بچوں کو ان کے آباء واجداد کی طرح جہادِ آزادی کے لیے مجاہد بنائیں گے، لیکن یہ تو فقیر اور بوریا نشین تھے، ان لوگوں نے مفت طعام و قیام کے ساتھ مفت تعلیم کا بھی پلان کیسے تیار کیا؟ یہ قابل حیرت بات تھی کہ ان لوگوں نے مدرسہ بنایا اور قوم کو پیغام دیا کہ اگر غلامی کی لعنت کی زنجیر توڑ کر آزاد ہونا ہے تو اس مدرسہ کو زندہ رکھیں۔ پھر لوگوں نے دل کھول کر اس کی مدد کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند برسوں کے اندر بخارا، سمرقند، تاشقند اور ہندوستان کے شہر شہر سے لڑکے جمع ہونا شروع ہوگئے جن کو مفت تعلیم دی جاتی تھی، انھوں نے قوم کو یہ بتلایا کہ اگر یہ مدرسہ زندہ ہے تو آپ زندہ ہیں اور آپ کی اولاد زندہ ہے، آپ کے گھر میں اسلام کی روشنی زندہ ہے اور آپ زندہ ہیں۔

جنگ آزادی، اسلام کی آبیاری، وطن کی حفاظت، اسلام دشمن طاقتوں سے لوہا لینے کے لیے ایک تحریک کی شکل میں مجاہدین آزادی کو پیدا کرنے کے لیے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی اور پھر دارالعلوم دیوبند نے ایسے سپوتوں کو پیدا کیا جنھوں نے اس ملک کے اندر آزادئ وطن کی آگ جلائی۔ اگر پوچھا جائے کہ ان میں سب سے پہلے سپوت اور دارالعلوم دیوبند کا سب سے مایۂ ناز سرمایہ کون ہے؟ تو جواب حضرت شیخ الہندؒ ہوگا، جو دیوبند کے رہنے والے تھے۔ مولانا محمود حسن صاحب پستہ قد اور دبلے پتلے انسان تھے لیکن اس شخص کے دل کے اندر کیسی آزادئ وطن کی آگ تھی جس کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ صوبہ جات متحدہ کا انگریز گورنر مسٹر کہتا تھا: ''اگر شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو جلا کر راکھ کردیا جائے تو ان کی راکھ کے اندر سے بھی انگریز دشمنی کی بو آئے گی۔''

انھوں نے 'ریشمی رومال' کی تحریک چلاکر انگریزوں کو حیران کردیا اور ان کو آخر تک معلوم نہیں ہوا کہ یہ تحریک کون چلا رہا ہے۔ انگریز حضرت

اس ملک کو ہندو اسٹیٹ بننا چاہیے چنانچہ ہندوؤں کے قدآور لوگ جو برابر آزادی میں شریک تھے، انھوں نے ہی یہ آواز اُٹھائی کہ اب ملک کا دستور سیکولر اسٹیٹ نہ بن کر ایک ہندو اسٹیٹ ہونا چاہیے۔ جمعیہ کے اکابرین اس رائے کے خلاف کھڑے ہوگئے کہ جو ہم سے وعدے کیے گئے تھے اُن وعدوں کو پورا کرو کیونکہ اگر ملک تقسیم ہوا ہے تو تم نے دستخط کیے ہیں، ہم نے نہیں۔ اس لیے اس ملک کا دستور سیکولر بنے گا۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور دوسرے علماء کو اس تحریک کا سربراہ سمجھتے رہے لیکن یہ شیخ الہندؒ کا دماغ تھا جو انگریزوں کی سمجھ سے بالاتر تھا اور انھوں نے سینکڑوں ایسے جیالے اور جید علماء پیدا کیے جنھوں نے انگریزی حکومت کی ناک میں دم کردیا تھا۔ شیخ الہندؒ کے ساتھ مالٹا میں اسیر شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے جو شیخ الہندؒ کے خاص شاگرد اور خاص خادم کا درجہ رکھتے تھے۔ انھوں نے شیخ الہندؒ کی خاطر جیل جانا ضروری سمجھا اور شیخ الہندؒ کی خدمت کے لیے جیل کی صعوبتوں کو کاٹا۔

شیخ الہندؒ آگے چل کر دارالعلوم کے سب سے بڑے استاذ بنے، ساتھ ہی انھوں نے آزادئ ہند کے لیے اپنے شاگردوں کی ایک ٹیم اور جماعت تیار کرکے باضابطہ تحریک آزادی شروع کی۔ تاریخ میں یہ تحریک 'تحریک ریشمی رومال' کے نام سے مشہور ہے۔ شیخ الہندؒ نے اس تحریک میں رنگ و روغن بھرنے کے لیے حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو کابل بھیجا، دوسری طرف شیخ الہندؒ خلافت اسلامیہ سے تعاون حاصل کرنے کے لیے حجاز مقدس تشریف لے گئے۔ شیخ الہندؒ کی یہ تحریک اگر کامیاب ہوگئی ہوتی تو ہندوستان کب کا آزاد ہوگیا ہوتا لیکن قدرت ابھی اور قربانیاں چاہتی تھی۔ شریف مکہ کی غداری کی وجہ سے ریشمی خطوط (ریشمی رومال تحریک کے خطوط) پکڑے گئے اور حجاز مقدس ہی سے آپ کو گرفتار کرلیا گیا۔ گرفتاری کے بعد آپ کو مالٹا بھیج دیا گیا۔ شیخ الہندؒ جب مالٹا سے رہا ہوکر آئے تو عام منظرنامہ بدل چکا تھا اس لیے انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے دوسرا طریقہ اختیار کیا اور جمعیۃ علماء ہند کو مشورہ دیا کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دے اور تشدد کو چھوڑ کر عدم تشدد کا نعرہ لگائے۔ شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد ان کے شاگرد خاص رفیق مالٹا حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی اور شیخ الہندؒ کے شاگرد حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ وغیرہ نے ان کے نقش قدم پر چل کر تحریک آزادی کو آگے بڑھایا۔

یہ ایک سوال ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی ضرورت کیوں پڑی اور شیخ الہندؒ نے اس کو کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرنے کا مشورہ کیوں دیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدوجہد آزادی میں کوئی ایسی مشترکہ تحریک نہیں تھی، جس کے بینر تلے مسلک ومذہب کی قید سے آزاد ہوکر محض ایک ہندوستانی ہونے کی بنیاد پر یہ لڑائی لڑی جائے، ملک کا یہی نقشہ تھا کہ ۲۳؍نومبر ۱۹۱۹ء کو بمقام دہلی 'خلافت کانفرنس' ہوئی، جس میں ملک کے کونے کونے سے علمائے کرام تشریف لائے، ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی مالٹا کی جیل سے رہائی کی اطلاعات آرہی ہیں، اس لیے ایک ایسا پلیٹ فارم ہونا چاہیے جس پر حضرت شیخ الہندؒ ہندوستان آکر مکمل آزادی وطن کی تحریک کو چلا سکیں۔ چنانچہ اسی وقت فیصلہ لیا اور امرتسر میں ہندوستان کے ممتاز علماء نے جمع ہوکر جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد ۱۹۱۹ء میں رکھی اور شیخ الہندؒ کے شاگرد حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کو عارضی صدر بنایا گیا۔ حضرت شیخ الہندؒ ۱۹۲۰ء میں مالٹا سے ہندوستان تشریف لائے اور اسی سال دہلی میں جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا سالانہ جلسہ ہوا جس میں ان کو جمعیۃ علماء ہند کا مستقل صدر بنایا گیا۔

آپ نے اپنے خطبہ صدارت میں خاص طور پر علماء کو جھنجھوڑا اور فرمایا کہ اسلام ایک کامل و مکمل مذہب ہے اور تمام اجتماعی اور انفرادی شعبوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ جو لوگ مدرسوں میں سبق پڑھا کر اپنے حجروں میں بیٹھے رہنے کو اسلام کے حق کی ادائیگی کے لیے کافی سمجھتے ہیں وہ لوگ اسلام کے پاک وصاف دامن پر داغ لگا رہے ہیں۔ اس اجلاس کے بارہ روز کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کا انتقال ہوگیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے بعد جمعیۃ علماء ہند نے حالات کے مزاج کو سمجھتے ہوئے فراست ایمانی پر مبنی ایک حکمت عملی اختیار کی اور فرقہ وارانہ ذہنیت کے پھیلتے زہریلے اثرات کو روکنے کے لیے برادرانِ وطن پر مشتمل تنظیم کانگریس سے اتحاد کرکے ملک کی مکمل آزادی کے لیے فرقہ و مذہب کی قید سے آزاد ہوکر لڑائی شروع کی۔

آزادئ ملک کی خاطر جیل کی صعوبتیں

شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ نے آزادی کے حوالے سے اپنے استاذ کی کڑھن اور بے چینی کو جذب کرلیا تھا، چنانچہ انھوں نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے سینہ اور دل کے اندر استعماری قوتوں کے خلاف جو آگ سمائی ہوئی تھی اس کو اور تیز تر کردیا اور جہادِ آزادی کے لیے سینہ سپر ہوگئے۔ استاذِ محترم کے دنیا سے چلے جانے کے بعد حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ مکمل طور پر ملک کو آزادی دلانے میں لگ گئے۔ اپنے استاذ کی فکر کو آگے بڑھانا حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ایسا کارنامہ رہا جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ نے اپنی اسّی سالہ زندگی میں کم وبیش نو سال انگریز کی جیل میں گزارے ہیں یعنی یوں سمجھئے کہ ہر آٹھ دن کے اندر آپ کا ایک دن جیل میں گزرا ہے اور اس کے اندر قید تنہائی بھی ہوئی، صعوبتیں اور مشکلات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ کس جیل میں آپ کو سب سے زیادہ تکلیف ہوئی تو فرمایا کہ سابرمتی جیل گجرات کے اندر قید بڑی بامشقت تھی۔

سیکولر دستور بنوانے میں جمعیۃ علماء ہند کا کردار

ان کی قیادت میں جیسے جیسے ملک کی آزادی قریب آتی گئی، یہ لوگ انڈین نیشنل کانگریس کے بنیادی لوگوں مثلاً موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی سے برابر عہد لیتے چلتے ہیں کہ ملک کی آزادی کے بعد ملک کا دستور سیکولر بنے گا اور کانگریس بھی وعدہ کرتی ہے کہ مسلمانوں کی مسجدیں، مسلمانوں کے مدرسے، مسلمانوں کے امام باڑے، مسلمانوں کے قبرستان، مسلمانوں کی زبان، مسلمانوں کا کلچر، مسلمانوں کی تہذیب سب چیزیں محفوظ رہیں گی اور ملک کا دستور سیکولر دستور بنے گا۔ ان لوگوں کا تیقن اور دانشمندی دیکھئے کہ یہ سمجھتے تھے کہ ملک کی اکثریت ہندو ہے اور آج سے نہیں ہے، آٹھ سو سال اس ملک پر مسلمانوں نے حکومت کی ہے، اکثریت تو ہندو ہی کی تھی، وہ بدل تو نہیں گئی تھی، لیکن دستور ہندوستان کا سیکولر ہونا چاہیے، اللہ نے ان کو عجیب وغریب عقل ودانش سے نوازا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ملک آزاد ہوا اور تقسیم ہوگیا، اسلام کے نام پر ایک دوسرا ملک بن گیا، اس ملک کے بن جانے کے بعد قدرتی طور پر یہ مسئلہ اُٹھنا تھا کہ جب اسلام کے نام پر مسلمانوں نے اپنا ایک حصہ لے لیا ہے تو اس ملک کو ہندو اسٹیٹ بننا چاہیے چنانچہ ہندوؤں کے قدآور لوگ جو برابر آزادی میں شریک تھے، انھوں نے ہی یہ آواز اُٹھائی کہ اب ملک کا دستور سیکولر اسٹیٹ نہ بن کر ایک ہندو اسٹیٹ ہونا چاہیے۔ جمعیہ کے اکابرین اس رائے کے خلاف کھڑے ہوگئے کہ جو ہم سے وعدے کیے گئے تھے اُن وعدوں کو پورا کرو کیونکہ اگر ملک تقسیم ہوا ہے تو تم نے دستخط کیے ہیں، ہم نے نہیں۔ اس لیے اس ملک کا دستور سیکولر بنے گا۔ جمعیۃ علماء ہند کا مطالبہ اتنا مضبوط تھا کہ اس مطالبہ کے سامنے سرتسلیم خم کرنا پڑا اور ملک کا دستور سیکولر بنا۔ ◻◻

ہفت روزہ
الجمعیۃ
نئی دہلی
شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

آزادی کے ۷۴ سال
کیا کھویا؟ کیا پایا

آزادی، خودمختاری اور جمہوری حکومت یقیناً کسی بھی زندہ، بیدار، غیور اور انسانیت دوست قوم کے لیے ایک نعمت اور بیش بہا دولت ہوتی ہے۔ ہندستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والے جانباز اور جیالے فرزندوں اور جواں عزم سپوتوں کے سامنے آزادی کا یہی خوبصورت تصور تھا جس کے سہارے انھوں نے طویل تاریکی اور غیر ملکی حکمرانی کا سینہ چیر کر آزادی کی جاں نواز اور جنوں انگیز سحر کی نمود کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ اور قوتِ کار کی آخری حرکت بھی اس کے لیے صرف کر ڈالی تھی۔ ساری دنیا نے اسی جانبازی اور جاں سپاری کا یہ نتیجہ دیکھا کہ جن کی حکومت میں کبھی سورج غروب نہ ہوتا تھا ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو ہندستان سے انھیں اپنی بساط لپیٹ کر اپنے وطن انگلستان کی راہ لینا پڑی۔

۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کا سورج طلوع ہوا۔ امید تھی کہ سورج کی اس روشنی نے جیسے غیر ملکی استبداد کے سیاسی نشانات کو مٹا کر ہندستانی عوام کو اپنی بساطِ سیاست بچھانے اور اپنے مستقبل کو سنوارنے کا سنہری موقع فراہم کیا ہے۔ ایسے ہی آزادی کی شمع وطن عزیز کو رشوت ستانی، نفع خوری، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، تعصب و تنگ نظری اور فرقہ وارانہ عصبیت کے اندھیروں سے بھی نجات دلا دے گی، لیکن افسوس کہ ہم آج جب آزادی کی ۷۵ ویں سالگرہ مناتے ہوئے اپنے ماضی کا محاسبہ کرتے ہیں تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی، جب ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی دورِ حکومت کے مقابلہ میں یہ تمام برائیاں آج نہ صرف موجود ہیں بلکہ یہ سب ہمارے معاشرہ کا ایک جزوِ لاینفک بن چکی ہیں۔

خاص طور پر فرقہ وارانہ عصبیت نے ہندستان میں اپنے دائرہ کو جس بڑے پیمانے پر وسیع کیا ہے اس نے تو ہماری آزادی اور جمہوریت پر ایک سوالیہ نشان ہی لگا دیا ہے، وہ کونسا دن ہے جب سورج کی کرنیں مسلمانوں اور اقلیتوں کی تباہی و بربادی کی منحوس خبر کے ساتھ نمودار نہ ہوتی ہوں؟ اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ ہر روز نئی تکنیک اور نئی منصوبہ بندی کے ساتھ مسلم کشی نہ کی جاتی ہو۔ کیا ہمارے رہنماؤں نے انگریزی سامراج کی سنگینیوں اور پھانسی کے پھندوں کا مقابلہ کر کے ایسی ہی آزادی کا خواب دیکھا تھا؟ یہ سوال مسلسل ۷۴ برسوں سے اپنا جواب ڈھونڈ رہا ہے۔ سوویت یونین میں سولہ ریاستوں کو ستر سال تک بنوکِ شمشیر کمیونزم اور سوشلزم کے نام پر ایک رکھنے کی کوشش کی گئی مگر چونکہ وہاں آپس میں بدترین معاشی اور سیاسی امتیاز موجود تھا اس لیے ہزار کوششوں کے باوجود وہاں کمیونزم کو زبردست زوال سے دوچار ہونا پڑا، پھر ملک کے موجودہ حالات میں ہندستان کو کیسے متحد رکھا جا سکے گا جبکہ یہاں قدم قدم پر اقلیتوں اور مسلمانوں کو امتیاز، عصبیت اور فرقہ واریت کے سایوں سے گزرنا پڑ رہا ہے، ہندستان کے ہر محبِّ وطن شہری کو یہی غم کھائے جا رہا ہے۔

جس وقت آپ یہ سطریں پڑھ رہے ہوں گے ملک آزادی کی ۷۵ ویں سالگرہ منا رہا ہوگا۔ ہم ہر سال یومِ آزادی پر ملک کے اتحاد و یکجہتی کا عہد کرتے ہیں مگر یہ ہمارا عہد کتنے قدم ہمارے ساتھ چلتا ہے اسے ہم بہت اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں۔ ۷۴ سال کا عرصہ قومی تعمیر کے لیے کوئی کم عرصہ نہیں ہے مگر کیا ہم نے کبھی اس نکتے پر غور کیا ہے کہ ہم آج بھی وہیں ہیں جہاں سے ۱۹۴۷ء میں آج ہی کے دن ہم نے اپنا آزاد سفر شروع کیا تھا۔

آج پوری دُنیا ہماری طرف دیکھ رہی ہے اور جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی کمزوری اور برائی ایسی نہیں ہے جو ہم میں نہیں ہے تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔

یہ تمام حالات بحیثیت مسلمان اور خیر امت ہونے کے خود ہمارے لیے بھی لمحۂ فکریہ ہیں آج ملت اسلامیہ ہند جن گوناگوں مسائل سے دوچار ہے ان سے ہم سب واقف ہیں۔ آزاد ہندستان میں ان کا حل خود ہمارے اتحاد میں پوشیدہ ہے۔ ایسا اتحاد جو جذبات کی بنیاد پر نہیں بلکہ اصولوں اور قدروں کی بنیاد پر ہو۔ جذبات کی بنیاد پر اتحاد کے نتائج ہم مسلسل ۷۴ برسوں سے دیکھ رہے ہیں، ہمارا تجربہ ہے کہ ہمارے رہنما جتنی تیزی کے ساتھ ایک ٹیبل پر جمع ہوتے ہیں اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ اس ٹیبل کو یتیم کر ڈالتے ہیں۔ ہم کسی ملّی تنظیم کے قیام کے مخالف نہیں ہیں لیکن اتنا ضرور چاہتے ہیں کہ تنظیم قائم ہو تو کچھ کام بھی کر کے دِکھائے، ملت کی تعمیر میں اس کا حصہ صاف نظر آنا چاہیے۔

ہم صاف کہہ دینا چاہتے ہیں کہ آزاد ہندستان میں محروم و مقہور مسلمانوں کے مسائل کا حل تنظیم برائے تنقید میں نہیں بلکہ تنظیم برائے تعمیر میں ہے، ہم اپنے لیڈروں اور رہنماؤں سے بھی مؤدبانہ درخواست کرنا چاہتے ہیں کہ خدا کے لیے وہ آزادی کے ان ۷۴ برسوں میں اپنے کام اور کردار کا محاسبہ کریں اور سوچیں کہ انھوں نے یا ان کی تنظیموں نے مجموعی طور پر مسلمانوں کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کی کوشش کی ہے یا خدانخواستہ انھوں نے مسلمانوں کا راستہ کھوٹا کیا ہے۔

اس موقع پر تحدیث بالنعمہ کے طور پر ہم بلاخوف لومۃ لائم کہہ سکتے ہیں کہ ہندستانی مسلمانوں کی سب سے قدیم تنظیم جمعیۃ علماء ہند جس نے دورِ غلامی میں ملک کی آزادی کے لیے سرفروشانہ جدوجہد کی، آزادی کے ان ۷۴ برسوں میں اس نے اپنے طے شدہ نصب العین کے مطابق نہ صرف مسلمانوں کی ہمت و حوصلہ کو جلا بخشی بلکہ ملّی تعمیر کے لیے اس نے جو جدوجہد کی ہے وہ مسلمانانِ ہند کی ملّی تاریخ کا ایک زرّیں باب ہے۔

جمعیۃ علماء ہند اور اس کی مخلص و فعال قیادت نے جماعتی عصبیت سے بالاتر ہو کر خالص ملّی مفاد کے لیے ہمیشہ ملّی رہنماؤں کو ساتھ لے کر کام کرنے کی کوشش کی، اسے اگرچہ متعدد بار اس راہ میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا مگر وہ دل برداشتہ نہیں ہوئی اور آج بھی اس کی سمت سفر یہ ہی ہے۔

ہندستان کی آزادی کسی ایک فرد، جماعت یا قوم و مذہب کی مرہونِ منّت نہیں ہے، وطن عزیز کی آزادی کے لیے جتنی برادرانِ وطن اور ان کے لیڈروں مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور دوسروں نے قربانیاں دیں اس سے کہیں زیادہ اقلیتوں، مسلمانوں اور ان کے رہنماؤں نے قربانیاں دے کر اس ملک کو آزادی سے ہمکنار کرایا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کا عتاب کس پر نازل ہوا، دلّی کے چاروں کونوں پر پھانسی کے پھندوں پر کون چڑھے وہ وہی لوگ تھے جنھیں آج اقلیت کا نام دے کر ہراساں اور خوفزدہ کیا جا رہا ہے۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک نوے سال کے اس عرصہ میں اقلیتوں اور مسلمانوں نے ملک کی آزادی کے لیے جو بیش بہا قربانیاں دی ہیں ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ آبادی کے تناسب کے اعتبار سے برادرانِ وطن نے اس کی عشر عشیر بھی قربانی پیش نہیں کی، پھر کیا وجہ ہے کہ آزادی کے بعد اقلیتوں اور مسلمانوں کو نہ صرف یہ کہ آج تک ان کے دستوری حقوق سے محروم کر دینے کی کوششیں کی جا رہی ہیں بلکہ ان کو ملک کے دوسرے درجہ کی شہریت قبول کرنے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے۔

آج ہندستان کا مسلمان فرقہ پرستی کے بوجھ تلے کراہ رہا ہے۔ دستوری تحفظ کے باوجود نہ اس کی جان محفوظ ہے نہ مال اور نہ عزت و آبرو جبکہ فرقہ پرست جنونی اپنی سیاسی اور مادّی طاقت کے بل پر برہنہ اسلحوں کے ساتھ کھلم کھلا دندناتا پھر رہا ہے، سیکولر کہی جانے والی پارٹیوں اور ان کے لیڈروں کی چشم پوشی کی سیاست نے ان لوگوں کو اور بھی ڈھیٹ بنا دیا ہے اور اب وہ یہ صاف طور پر کہہ رہے ہیں کہ اس ملک میں ان کی راہ کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ بات کس قدر افسوسناک ہے کہ عدلیہ، انصاف، قانون اور عوامی رائے عامہ کو روندتے ہوئے مٹھی بھر فرقہ پرست مسلسل سات سالوں سے بیف کے نام پر کبھی تبدیلیٔ مذہب کے نام پر، کبھی اضافہ آبادی کے نام پر اور کبھی مسلم پرسنل لاء کے نام پر نہتے اور بے قصور مسلمانوں کو نشانہ بنا رہے ہیں۔

آج کوئی اقلیت کا فرد یا مسلمان ہی نہیں بلکہ ہر انصاف پسند شخص زبانِ حال سے یہ سوال کر رہا ہے کہ قانون و انصاف کا مذاق اُڑانے اور عدلیہ کی کھلی توہین کرنے والوں کے ساتھ آزاد اور جمہوری ملک میں یہ مراعات کیوں ہیں؟ وہ صرف سوال ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک حد تک ملک کے اتحاد اور قومی یکجہتی کے عنوان پر تشویش کا شکار بھی ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے سامنے سوویت یونین کی مثال موجود ہے جو تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔

بہرحال ہم ایک بار پھر اپنی اور اپنے ملک کی آزادی کا ۷۵ واں جشن مناتے ہوئے ہندستان کے شہریوں سے امید رکھتے ہیں کہ وہ خون کے دریا کو پار کرتے ہوئے حاصل ہونے والی آزادی کی قدر و قیمت کو پہچانیں گے اور آج اس کے تحفظ کا عہد کرتے ہوئے ملک کے اتحاد و یکجہتی کو اپنی زندگی کا مشن بنائیں گے۔ ہمارے نزدیک فرقہ پرستی ایک بدترین لعنت ہے اور ہم اس کا مقابلہ اتحاد و یکجہتی کے ساتھ ہی کر سکتے ہیں۔

ہمارے محترم قارئین آزادی کے ۷۴ ویں جشن کے موقع پر آزادی کی پرخلوص مبارکباد قبول فرمائیں۔ ▫▫

جشن آزادی

راز اعظمی، گورکھپور

جشن آزادی کا پرچم آج لہراتا ہوں میں
پھر شہیدانِ وطن کا گیت دُہراتا ہوں میں

گاندھی و حسرت کی قربانی ابھی تک یاد ہے
یاد ہے جھانسی کی وہ رانی ابھی تک یاد ہے

دیش کو اونچا اُٹھانا اب ہمارا کام ہے
اس کو طاقتور بنانا اب ہمارا کام ہے

دیش کی خاطر ہمیں جینا اور مرنا ہے دوست
ہم کو دُنیا میں کسی سے اب نہیں ڈرنا ہے دوست

دستکاروں کے یہاں تو ہاتھ بھی کاٹے گئے
ذات کے ہی نام پر ہم دیش میں بانٹے گئے

پیڑ آزادی کا بویا پھل تو ہم کھانے لگے
گیت نفرت کا مگر ہر شاخ پر گانے لگے

دیش میں وحشت بڑھی اور سر یہاں کاٹا گیا
کتنی بے دردی سے لوگو دیش کو بانٹا گیا

ہاں پچاسوں سال سے مانا وطن آزاد ہے
پر وطن یہ رہبروں کی لوٹ سے برباد ہے

ذرا یاد کرو قربانی

ہندستان کی مسلح افواج میں مسلمان اور انکے کارنامے

تحریر: محمد جمال اختر

ہندوستانی فوج میں مسلمان بلاشبہ ایک اہم موضوع ہیں جس کے کئی پہلو ہیں۔ ایک پہلو تو فوج میں مسلمانوں کی تعداد کا ہے جس پر آجکل ملک میں بحث چل رہی ہے۔ الگ الگ خیالات سامنے آرہے ہیں مگر دوسرا پہلو ہے مسلمانوں کے کردار کا، جس کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کی زبان پر ہمیشہ سب سے پہلے جو نام آتا ہے وہ حولدار عبدالحمید کا ہے، حالانکہ ہندوستانی فوج میں مسلمان ایئر چیف مارشل بھی ہوئے۔ لیفٹیننٹ جنرل بھی، بریگیڈیئر بھی اور کیپٹن بھی، مگر جب فوج میں مسلمانوں کی بہادری کی کہانی شروع ہوتی ہے تو نام حولدار عبدالحمید کا سب سے پہلے زبان پر آتا ہے کیونکہ ۱۹۶۵ء کی ہند-پاک جنگ میں حولدار عبدالحمید نے دشمنوں کے ٹینکوں کو تنہا اُڑا دیا تھا۔ بریگیڈیئر محمد عثمان نے تقسیم ملک کے وقت پاکستان کا رُخ کرنے کی پیشکش کو ٹھکرا کر حب الوطنی کے ساتھ سیکولر قدروں کا ثبوت دے دیا تھا۔ ادریس حسن لطیف کا نام سب جانتے ہیں، جو ایئر چیف مارشل بنے۔ لیفٹیننٹ جنرل پی ایم حارث کا نام بھی محتاج تعارف نہیں۔ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب ایک مسلم لیفٹیننٹ جنرل پی ایم حارث آرمی چیف آف آرمی بن سکتے تھے، لیکن ان سے جونیئر بپن راوت کو خصوصی پروموشن ملا جس کے سبب ۲۶ آرمی چیف کی فہرست میں ایک بھی مسلم نام نہیں آسکا، مگر ان کی خدمات اور کارناموں سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے۔

یہ بحث ہمیشہ سے جاری ہے کہ ہندوستانی فوج میں مسلمانوں کی تعداد کم نہیں، بلکہ بہت کم ہے جس کا ایک سبب ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد انگریزوں کی بغاوت کے خوف سے مسلمانوں کو نظرانداز کرنے کی پالیسی بھی ہے جس پر اب تک عمل ہورہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راجپوت رجمنٹ ہے، گورکھا رجمنٹ ہے، سکھ رجمنٹ ہے، مگر مسلم رجمنٹ نہیں۔ اس کے باوجود ہندوستانی فوج میں مسلمان جوانوں اور افسران کو جہاں بھی جنگی جوہر دِکھانے کا موقع ملا ہے اسے ہاتھوں سے نکلنے نہیں دیا۔ کسی نے جان دے کر اور کسی نے جان لے کر ملک کی سرحد کی حفاظت کی ہے۔

شیر نوشیرا بریگیڈیئر محمد عثمان

بریگیڈیئر محمد عثمان ۱۹۴۷ء میں ہند-پاک جنگ میں شہید ہونے والے سب سے سینئر افسر تھے۔ محمد عثمان کی تقسیم کے بعد ہندوستان سے وابستگی دراصل مجموعی سیکولرازم کی ایک علامت بن گئی تھی کیونکہ تقسیم کے دوران انھوں نے کئی دیگر مسلم افسران کے ساتھ ساتھ پاکستانی فوج میں شامل ہونے کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ ہندوستانی فوج کا حصہ بننے کو ترجیح دی تھی۔ جولائی ۱۹۴۸ء میں جموں وکشمیر میں پاکستانی فوجیوں اور جنگجوؤں نے حملہ کیا تو اس لڑائی میں محمد عثمان شہید ہوگئے تھے۔ انھیں بہادری کے لیے دوسرا سب سے بڑا فوجی اعزاز مہاویر چکر بعد از مرگ دیا گیا۔ محمد عثمان ۱۵/جولائی ۱۹۱۲ء کو بی بی پور مئو ضلع میں پیدا ہوئے تھے۔ عثمان نے بعد میں فوج میں شمولیت اختیار کرنے کے لیے اپنا دماغ بنایا اور محدود وسائل کے باوجود ہندوستانی مشہور رائل ملٹری اکیڈمی سینڈہرسٹ (RMAS) میں داخلہ حاصل کیا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں انھیں ایک دوسرے لیفٹیننٹ کے طور پر مقرر کیا گیا اور یکم فروری ۱۹۳۴ء کو ہندوستانی آرمی کی تازہ ترین فہرست کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ ۱۲/مارچ ۱۹۳۴ء کو ایک سال کے لیے کیمرون کی ایک بٹالین تک ہندوستان کے ساتھ منسلک کیا گیا تھا۔ محمد عثمان کو ۳۰/اکتوبر ۱۹۳۶ء کو لیفٹیننٹ کے عہدے پر پروموشن ملا، جبکہ ۳۱/اگست ۱۹۴۱ء کو انھیں کیپٹن بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۴۴ء میں محمد عثمان کو عارضی میجر بنایا گیا تھا۔ ہند-پاک ۱۹۴۷ء جنگ کے دوران کشمیر پر قبضہ کے لیے پاکستانی فوج کے ساتھ جنگجوؤں کے دستے ہندوستان میں داخل ہوگئے تھے۔ جھانگر پر پاکستان کا قبضہ ہوگیا تھا، جو فوجی حکمت کے اعتبار سے بہت اہم تھا۔ یہ میجر پور اور کوٹلی کے قریب تھا۔ ۲۵/دسمبر ۱۹۴۷ء کو محمد عثمان کی ۵۰ویں پیراشوٹ بریگیڈیئر نے جنگ لڑی تھی اور علاقہ پر ہندوستان کو دوبارہ قبضہ دلا دیا تھا۔ اس کے تین ماہ بعد ہی پاکستان نے ایک بار پھر نوشیرا اور جھانگر پر حملہ کیا، حملہ بہت شدید تھا خوفناک جنگ ہوئی تھی، جس میں پاکستان کے تقریباً ایک ہزار فوجی مارے گئے تھے، جبکہ ہندوستان کے ۳۳ فوجی شہید ہوئے تھے، جن میں محمد عثمان بھی شامل تھے۔ انھیں شیر نوشیرا کا خطاب ملا تھا۔ اس وقت پاکستانی فوج نے ان کے سر پر پانچ ہزار روپے کا انعام رکھا تھا۔ محمد عثمان نے جب تک جھانگر پر قبضہ نہیں کرلیا، تب تک وہ زمین پر چٹائی بچھا کر سوتے تھے۔ میدان جنگ میں دم توڑنے سے قبل محمد عثمان نے کہا تھا کہ میں مر رہا ہوں، مگر اس علاقہ کو دشمن کے ہاتھوں میں مت جانے دینا۔

پھر ۱۹۶۵ء میں پاکستان کے خلاف جنگ میں حولدار عبدالحمید نے کھیم کرن سیکٹر کے اسال اتاڈ میں شہادت سے پہلے عبدالحمید نے اس وقت ’ماؤنٹیڈ جیپ‘ سے پاکستان کے چھ پیٹن ٹینک کو تباہ کردیا تھا، جو اس وقت ناقابل تصور سمجھا جاتا تھا۔ ساتویں ٹینک کو تباہ کرنے کی کوشش میں وہ شہید ہوئے تھے۔ حولدار عبدالحمید نے بڑی تیزی کے ساتھ پوزیشن بدل بدل کر پاکستانی ٹینکوں کو نشانہ بنایا تھا۔ پاکستانی فوج کو ہندوستانی فوج کی جانب سے اس قسم کے حملے کی امید نہیں تھی۔

۳۶ سالہ شہید بریگیڈیئر محمد عثمان کے جنازے میں ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو اور ان کی کابینہ کے وزراء نے شرکت کی تھی جنھیں پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ دہلی کے جامعہ نگر اوکھلا میں دفن کیا گیا تھا۔ ہندوستانی فوج نے جھانگر میں ۲۰۱۲ء میں ان کی صد سالہ تقریبات منائی تھیں۔

ویر جوان حولدار ویر عبدالحمید

کمپنی کوارٹر ماسٹر حولدار عبدالحمید کو ۱۹۶۵ء کی ہند-پاک جنگ میں بے پناہ بہادری اور جنگی جوہر دِکھانے کے سبب آج بھی قوم سلام کرتی ہے اور انھیں ہندوستانی فوج کے سب سے بڑے اعزاز پرم ویر چکر سے نوازا گیا تھا۔ حولدار عبدالحمید نے ۱۹۵۴ء میں ہندوستانی فوج میں شمولیت اختیار کی تھی، انھیں گریناڈیر کی چوتھی بٹالین میں شامل کیا گیا تھا، جنھوں نے چین کے خلاف ۱۹۶۲ء کی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ ان کی بٹالین نے نامکو چو میں چینی فوج کا مقابلہ کیا تھا، پھر ۱۹۶۵ء میں پاکستان کے خلاف جنگ میں حولدار عبدالحمید نے کھیم کرن سیکٹر کے اسال اتاڑ میں شہادت سے پہلے اس وقت ’ماؤنٹیڈ جیپ‘ سے پاکستان کے چھ پیٹن ٹینک کو تباہ کردیا تھا، جو اس وقت ناقابل تصور سمجھا جاتا تھا۔ ساتویں ٹینک کو تباہ کرنے کی کوشش میں وہ شہید ہوئے تھے۔ حولدار عبدالحمید نے بڑی تیزی کے ساتھ پوزیشن بدل بدل کر پاکستانی ٹینکوں کو نشانہ بنایا تھا۔ پاکستانی فوج کو ہندوستانی فوج کی جانب سے اس قسم کے حملے کی امید نہیں تھی۔ کئی ٹینکوں کی تباہی کے بعد پاکستانی فوج نے حولدار عبدالحمید کی پوزیشن دیکھ لی۔ اس نے ٹینک کا رُخ ان کی جانب موڑ دیا۔ عبدالحمید نے جیسے ہی ٹینک پر فائر کیا، ٹینک نے ان پر گولہ فائر کردیا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی گولیوں کا شکار ہوگئے۔ باقی فوجیوں نے عبدالحمید کے اعضا اکٹھے کرکے انھیں وہیں دفنا دیا تھا۔ عبدالحمید یکم جولائی ۱۹۳۳ء کو ایک سادہ درزی کے خاندان میں اتر پردیش کے غازی پور ضلع کے دھمو پور گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد لانس نائک عثمان فاروقی بھی گریناڈیئر بریگیڈیئر میں ایک نوجوان تھے۔ ہندوستانی فوج آج بھی پاکستان کے خلاف اس بہادری کو یاد کرتی ہے۔

پہلے سربراہ ایئر چیف مارشل ادریس حسن لطیف

ہندوستانی ایئرفورس کے پہلے مسلم چیف رہے تھے ادریس حسن لطیف۔ انھوں نے بطور چیف آف ایئر اسٹاف ۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۱ء تک خدمات سرانجام دیں۔ ہند-پاک جنگ ۱۹۷۱ء کے دوران وہ اسسٹنٹ چیف آف دی ایئر اسٹاف (پلان) رہے۔ ۱۹۷۱ء میں ان کو فوجی خدمات کے اعتراف میں تمغہ پرم وششٹ عطا کیا گیا۔ ۱۹۷۴ء میں ادریس حسن لطیف کو ایئر مارشل کے عہدے پر ترقی مل گئی اور ان کی تعیناتی بطور ایئر آفیسر ان چارج ایڈمنسٹریشن فضائیہ کے صدر دفتر میں ہوئی۔ ۱۹۷۵ء میں پٹنہ سیلاب کے دوران فضائیہ کی امدادی کارروائیوں کی قیادت کی۔ ۱۹۷۷ء میں انھیں نائب چیف آف ایئر اسٹاف بنا دیا گیا اور یکم ستمبر ۱۹۷۸ء کو ان کو چیف آف ایئر اسٹاف بنا دیا گیا۔ وہ پہلے اور اب تک کے واحد مسلمان تھے، جو فضائیہ یا کسی بھی فوج کے چیف کے عہدے تک پہنچے تھے۔

ادریس حسن لطیف کی پیدائش حیدرآباد (آندھرا پردیش) میں ۱۹۲۳ء میں ہوئی۔ ان کے والد حسن لطیف سابق ریاست حیدرآباد میں چیف انجینئر تھے۔ ثانوی تعلیم نظام کالج، حیدرآباد سے اور گریجویٹ ڈیفنس سروس اسٹاف کالج اور نیشنل ڈیفنس کالج سے مکمل کی۔ ادریس لطیف ۱۹۴۲ء میں رائل انڈین ایئر فورس میں کمیشن سے بھرتی ہوئے اور دوسری جنگ عظیم کے محاذ راخین ریاست میں جاری برما مہم کا حصہ بنے، بعد ازاں وہ انڈونیشیا بھیجے جانے والے اس مشاورتی گروپ کے رکن بنے، جو انڈونیشیا میں جیٹ لڑا کا طیاروں کی شروعات کے لیے تھا۔ لطیف نے بطور ایئر ڈیفنس کمانڈر اور ایسٹرن ایئر کمانڈ میں بطور سینئر ایئر اسٹاف آفیسر خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۵ء تک ادریس حسن لطیف نے واشنگٹن ڈی سی میں ہندوستانی سفارت خانہ میں بطور ایئر اتاشی کام کیا۔ ۱۹۷۴ء میں انھیں ایئر مارشل کے عہدے پر پروموشن ملا۔ انھیں ایئر فورس ہیڈ کوارٹر میں ایئر افسر ایئر انچارج بنایا گیا تھا۔ ان کی فوجی سروس کے بعد بھی حکومت نے ان کی سفارتی اہلیت کو استعمال کیا تھا۔ وہ بطور گورنر ریاست مہاراشٹر (۱۹۸۲-۸۵ء) رہے اور اس کے بعد ۱۹۸۸ء تک فرانس میں ہندوستانی سفیر رہے۔ ۳۰/اپریل کو ۹۴ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

لیفٹیننٹ جنرل پی ایم حارث

آزاد ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب ایک مسلم لیفٹیننٹ جنرل پی ایم حارث آرمی چیف بن سکتے تھے لیکن ان سے جونیئر بپن راوت کو یہ عہدہ دے دیا گیا۔ اس طرح اب تک ۲۶ آرمی چیف کی فہرست میں ایک بھی مسلم نام نہیں آسکا۔

لیفٹیننٹ جنرل جیسے اونچے عہدوں تک مسلمانوں کا پہنچنا اپنے آپ میں ایک غیر معمولی بات ہے، لیکن کیرالہ کے کوزی کوڈ ضلع کے چیروا پپا گاؤں کے پی محمد علی کے بیٹے پی ایم حارث کا چیف آف آرمی اسٹاف بننے کا خواب ادھورا رہ گیا۔ پی ایم حارث ۱۶/ستمبر ۲۰۱۶ء کو جنوبی کمان کے جنرل آفیسر کمانڈنگ اِن چیف بنائے گئے۔

بہرحال ہندوستانی فوج میں کسی سینئر افسر کو سپرسیڈ کرکے جونیئر افسر کو چیف آف آرمی اسٹاف بنانے کا یہ پہلا معاملہ نہیں ہے، اسی طرح ملک کی بیوروکریسی میں بھی کئی جونیئر افسروں کو سینئر افسروں کو سپرسیڈ کرکے کابینہ سکریٹری، ہوم سکریٹری، چیف سکریٹری جیسے عہدوں پر بٹھایا گیا ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل حارث نے ملٹری آبزرور، چیف پرسن آفیسر، انگولا میں ریجنل کمانڈر کے علاوہ بٹالین، بریگیڈیئر اور ڈیویژن کی بھی قیادت کرچکے ہیں۔ فی الحال ساؤتھ کمان کے جنرل آفیسر کمانڈنگ اِن چیف کے عہدے پر ہیں، جو ہندوستانی فوج کا جغرافیائی اعتبار سے سب سے بڑا فارمیشن سمجھا جاتا ہے۔

پی ایم حارث کو گاؤں چیراپپا کے لوگ انھیں عزت سے ’گریٹ سن آف دی ویلیج‘ کے نام سے پکارتے ہیں۔ پی ایم حارث کی بیوی زرینہ حارث کرنل آئی ایم رحمان کی بیٹی ہیں۔ حارث کے بیٹے ذہیب خود بھی فوج میں کمیشنڈ آفیسر ہیں۔

شہید کیپٹن حنیف الدین

کیپٹن حنیف الدین کارگل جنگ میں جان نچھاور کرنے والے ایک اور سپوت ہیں، جن کا تعلق راجپوتانہ رائفل کی گیارہویں بٹالین سے تھا۔ انھوں نے ۱۹۹۶ء میں انڈین ملٹری اکیڈمی میں شمولیت اختیار کی تھی اور ۷/جون ۱۹۹۷ء میں فوج میں شامل ہوئے تھے۔ کارگل جنگ کے دوران حنیف الدین نے ۱۸ ہزار فٹ کی بلندی پر دشمن کا مقابلہ کیا تھا۔ برف سے ڈھکی چوٹیوں پر خون کو منجمد کردینے والی ٹھنڈ میں حنیف الدین نے ملک کی حفاظت کرتے ہوئے جان دی تھی۔ پاکستانی فوج کی گولہ باری کے باوجود کیپٹن حنیف الدین نے بغیر کسی کور یا ڈھال چوٹی پر پیش قدمی جاری رکھی تھی۔ انھوں نے منزل پر پہنچ کر ہی دم لیا تھا جس کے بعد وہ گولہ باری کا نشانہ بنے تھے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کا جسد خاکی اب بھی دشمن کے قبضہ میں ہے۔ ان کی لاش کو لداخ کے پرخطر پہاڑی سلسلے سے برآمد نہیں کیا جاسکا تھا۔ ان کو فوج کا تیسرے سب سے بڑا اعزاز ویر چکر دیا گیا۔ حنیف الدین کی ماں ہیما عزیز کلاسیکل سنگر ہیں جو سنگیت ناٹک اکیڈمی سے وابستہ ہیں۔

حنیف الدین کی شہادت کے بعد ان کے اہل خاندان نے حکومت کی جانب سے پیٹرول پمپ یا گیس ایجنسی کی پیشکش کو شکریہ کے ساتھ قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ ان کی ماں کا کہنا تھا کہ ہم کو اس کی قطعی ضرورت نہیں۔ میرا ماننا ہے کہ اگر کسی کو مالی مدد کی ضرورت نہیں ہے تو پھر اس قسم کی پیشکش کو قبول نہیں کرنا چاہیے، مگر یہ صرف ان کا ذاتی خیال ہے۔ اگر کوئی اس پیشکش کو قبول کرتا ہے تب بھی اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ □□

آہ اپنا بھارت!

ڈاکٹر رشید الوحیدی

کیا قیامت ہے، یہ ہر سمت ہے کیسی ہلچل
زندگی تو ہی بتا کیوں ہے یہ نفرت کا عمل

آج ذہنوں میں تصور ہے مہابھارت کا
لے کے پیغام اُٹھیں ہیں یہ تو گڑیا سنگھل

اِک وہ بھارت تھا کہ جس میں بڑے ارمان کیساتھ
اپنے پرکھوں نے بنایا تھا محبت کا محل

تھی جہاں پیار کے پھولوں کی سہانی خوشبو
اسی دھرتی پہ ہے اب خوف کا کالا بادل

رام کی عظمت و ناموس پہ ہم بھی ہیں گواہ
نقش ہے دل پہ ابھی شاعر مشرق کی غزل

پھول کل تک تھے جو گلشن میں بہارِ گلشن
باغباں تو نے ہی کر ڈالا انھیں نذرِ اجل

احمد آباد وہ صنعت کا چمکتا سورج
ہائے گجرات وہ گاندھی کا حسین تاج محل

آج بھی اُجڑے مکانوں سے دھواں اُٹھتا ہے
شرم آتی نہیں کہتے ہو اسے ردِّ عمل

عصمتیں لوٹ لیں ان بہنوں کی تم نے سرِ راہ
جن کے سر سے کبھی سرکا نہ حیا کا آنچل

دیکھنا تھا تجھے یہ دن بھی میرے پیارے وطن
خونِ ناحق سے ہیں رنگین تیرے دشت وجبل

بھیڑیے شہروں میں گھس آئے ہیں توبہ توبہ
آدمی پھرتے ہیں ساماں لیے جنگل جنگل

ہے محبت کی یہاں پیاس میرے ہم وطنو!
کاش امرت کا پلا دے کوئی ٹھنڈا چھاگل

آزاد ہندستان میں فارغین مدارس کی اسناد اور مُلازمت کا مسئلہ

چند ضروری معروضات

تحریر: پروفیسر اختر الواسع

ہندستان کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے مدارسِ اسلامیہ میں رائج طرح طرح کے نصابِ تعلیم کی یکسانیت پر تو کافی زور دیا گیا ہے لیکن اسی کے ساتھ مدارس سے جاری ہونے والی اسناد کی یکسانیت بھی ضروری ہے جس پر اربابِ مدارس کو سنجیدگی سے غور کرنا ضروری ہے۔ یکساں نصاب اور یکساں اسناد سے ہم مدارس اور یونیورسٹیوں کے درمیان تعلیمی تبادلہ میں ہم آہنگی بھی لا سکتے ہیں اور عصری دانش گاہوں میں فارغین مدارس کی ملازمت میں جوان دنوں قیل وقال ہو رہی ہے اس پر بھی قدغن لگ سکتا ہے۔ اس موضوع پر نہ اہل مدارس سنجیدہ نظر آتے ہیں اور نہ یونیورسٹیوں کے اربابِ حل وعقد کو کوئی فکر ہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ ہندستان کے وہ مدارس جہاں سے عالمیت اور فضیلت کی ڈگری لے کر طلبہ نکلتے ہیں اور وہ یونیورسٹیوں میں جا کر مزید تعلیمی سلسلہ جاری رکھنا چاہتے ہیں ان کے سامنے کئی مسائل حائل ہو جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کا داخلہ محدود شعبوں میں ہی ہو پاتا ہے اور دوسری طرف دقت یہ ہے کہ ہندستان کی یونیورسٹیوں میں مدارس کی اسناد کو الگ الگ حیثیت حاصل ہے۔ کہیں عالمیت کو بارہویں قرار دیا جاتا ہے تو کہیں فضیلت کی ڈگری کو وہی درجہ حاصل ہے۔ کچھ جگہوں پر فضیلت کی ڈگری کو گریجویشن کے مساوی بھی قرار دیا جاتا ہے۔ بعض مدارس کی سند کو یونیورسٹیاں تسلیم تو کرتی ہیں مگر انگریزی سبجیکٹ نہ ہونے کی وجہ سے طلبہ کو داخلہ کے لیے ایک سال کا انتظار کرنا ہوتا ہے اور ان کا داخلہ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک وہ انگریزی مضمون کا امتحان پاس نہیں کر لیتے۔ اس یسار ویمین کی صورتحال جب یو جی سی یا یونیورسٹیوں کے ذمہ داروں کے سامنے پیش ہوتی ہے تو وہاں بڑی جگ ہنسائی ہوتی ہے اور مدارس کے غیر منضبط تعلیمی نظام پر طرح طرح کے فقرے کسے جاتے ہیں۔ مدارس کے فضلا کو صرف عصری دانش گاہوں میں داخلہ کے لیے ہی پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا بلکہ جب وہ یونیورسٹیوں سے بی ایڈ، ایم ایڈ، ایم اے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر نکلتے ہیں تو انھیں کچھ حکومتیں اور یونیورسٹیاں یہ کہہ کر ملازمت سے محروم کر دیتی ہیں کہ ان کے پاس دسویں اور بارہویں کی اسناد اور گریجویشن کی ڈگری نہیں ہے۔ صورتحال یہ ہے کہ فضلا کو مدارس کی انتظامیہ صرف عالمیت یا فضیلت کی ڈگری تفویض کرتی ہے، اس کے نیچے کے درجات کی کوئی ڈگری ہی نہیں دیتی کہ اسے دسویں یا بارہویں کے مساوی قرار دی جائے یا اس کو تسلیم کرانے کی کوئی تحریک چھیڑی جائے۔ اس قسم کے درجنوں مسائل فضلائے مدارس کے سامنے بکھرے پڑے ہیں جن پر غور کرنے کی فرصت نہ حکومتوں کو ہے اور نہ اس کی فکر اہل مدارس کو ہے۔

خدا بھلا کرے بہار میں نتیش کمار کی سرکار اور ان کی انتظامیہ کے ذمہ دار افسروں کا جن کی کوششوں سے ایک برس قبل جب بہار میں بڑے پیمانے پر یونیورسٹیوں میں اساتذہ کی تقرری ہوئی تو پھر بھی سینکڑوں فضلائے مدارس صرف اس لیے اس میں شامل نہیں کیے گئے کہ جن مدارس کے وہ فارغین تھے ان کی اسناد تسلیم شدہ نہیں تھیں۔ ان کے پاس دسویں کی ڈگری نہیں تھی۔ ایسی صورتِ حال میں ملک کا ایک صالح و صالحیت مند طبقہ ملازمت سے محروم اپنی کم مائیگی پر آنسو بہا رہا ہے جسے میں اس ملک کے نظام اور نارواضوابط کی ناکامی تصور کرتا ہوں۔ دہائیوں تک تدریسی خدمات انجام دیتے ہوئے میرا تجربہ ہے کہ مدارس سے نکل کر باذوق و ذہین طلبہ جب یونیورسٹیوں میں آتے ہیں تو وہ صلاحیت اور فکر و نظر کے اعتبار سے نہایت پختہ ہو جاتے ہیں اور انھیں میں اس ملک کا بہترین اثاثہ تصور کرتا ہوں لیکن جب وہ اہلیت کے باوجود کسی عذرِ لنگ کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور بے روزگاری ان کا مقدر ہو جاتی ہے تو میں کس تکلیف واذیت سے دوچار ہوتا ہوں اس کی کیفیت بیان نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک بھر کے اہل مدارس اس مسئلہ کی سنگینی پر غور کرنے کے لیے یکجا بیٹھیں اور اس کا حل پیش کریں۔

حکومتوں اور تعلیمی شعبوں کے ذمہ داروں کو سمجھنا چاہیے کہ مدارس کے فضلا جن مضامین میں یکتائے روزگار ہوتے ہیں انھیں ان مضامین کی تدریس کے لیے کیوں نہ منتخب کیا جائے۔ کیوں اہلیت رکھنے والوں کے مقابلے کم اہل لوگوں کا انتخاب کیا جائے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ملک بھر کے بہت سے اسکولوں اور کالجوں میں پہلے عربی اور فارسی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی مگر رفتہ رفتہ پہلے یو پی ایس سی سے دونوں زبانوں کو نکالا گیا، اس کے بعد اسکولوں اور کالجوں سے پہلے عربی پھر فارسی کو ختم کر دیا گیا۔ حکومتیں اُردو کے فروغ کے بلند بانگ دعوے کرتی ہیں مگر اُردو کو عربی اور فارسی کے ذریعے مضبوطی ملتی ہے اس سے وہ بے بہرہ ہیں۔ انھیں جاننا چاہیے کہ اگر اُردو کو فروغ دینا ہے تو عربی و فارسی کو بھی فروغ دینا ہوگا۔ دوسری طرف جاننے والے جانتے ہیں کہ مدارس کے فضلاء عربی، فارسی، اُردو، اسلامیات اور سماجیات جیسے مضامین کی تدریسی صلاحیت سے مالا مال ہوتے ہیں، اگر ان کا انتخاب ہائی اسکولوں، جونیئر کالجوں اور یونیورسٹیوں کی سطح پر کیا جائے تو تعلیمی معیار کو ہم بلند کر سکتے ہیں۔ میرا تو ماننا ہے کہ پرائمری اور مڈل اسکولوں میں جتنی تقرریاں ہوتی ہیں ان میں بھی فضلائے مدارس کی تقرری کو ہری جھنڈی دی جانی چاہیے کیونکہ تجربات بتاتے ہیں کہ فضلائے مدارس جس دلجمعی اور اخلاص کے ساتھ بچوں کی تعلیم وتربیت کو انجام دیتے ہیں ویسی توقع ہم عصری دانش گاہوں کے فارغ التحصیل افراد سے نہیں کر سکتے۔ عجیب بات ہے کہ جو فضلائے مدارس اپنی صلاحیت اور محنت کی بدولت یونیورسٹیوں کے نصاب کو پڑھتے ہیں اور اپنے اپنے میدانوں میں درجہ کمال کو پہنچتے ہیں اور اس کے بعد وہ ملک کی تعلیمی وتدریسی ذمہ داریوں کو احسن طریقے پر انجام دینے کے اہل ہو جاتے ہیں مگر انھیں اس کا موقع نہیں دیا جاتا اس لیے میرا مطالبہ ہے کہ جن مدارس کو یونیورسٹیوں نے داخلوں کے لیے تسلیم کر رکھا ہے ان کے فارغین کو ملازمتوں کا بھی اہل تسلیم کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں بعض یونیورسٹیوں کا رویہ نہایت افسوسناک ہے۔ اس کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، مولانا مظہر الحق یونیورسٹی، جامعہ ہمدرد اور عالیہ یونیورسٹی کلکتہ جیسے اداروں کو بھی ایک کوآرڈی نیشن کمیٹی تشکیل دینی چاہیے تاکہ ان کے یہاں سے فارغ التحصیل فضلائے مدارس کی ملازمتوں کی راہیں آسان ہو سکیں۔ افسوس اس بات پر بھی ہے کہ اتنے سنگین مسئلہ پر نہ اہل مدارس نے کبھی فکرمندی کا اظہار کیا اور نہ ہی حکومتوں اور اربابِ حل وعقد کے سامنے کسی طرح نمائندگی یا مطالبہ کیا گیا۔ یونیورسٹیوں سے رہ رہ کر آوازیں اُٹھیں مگر وہ دور تک نہ جا سکیں۔ کچھ یونیورسٹیوں میں مدارس کے فارغین کو ملازمت دی بھی گئی ہے لیکن رہ رہ کر فضلائے مدارس کے بڑھتے قدم پر قدغن بھی لگایا جاتا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سلسلے میں پوری تیاری اور استدلال کے ساتھ آگے بڑھا جائے۔

مجموعی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے سب سے پہلے بڑے مدارس کے ذمہ داران کو آگے آنا ہوگا اور انھیں اسناد کی یکسانیت کو یقینی بنانا ہوگا، اس کے بعد یونیورسٹیوں اور حکومت کے تعلیمی محکموں سے رجوع کرنا ہوگا۔ اگر اہل مدارس سنجیدہ ہوتے ہیں تو پھر یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور ذمہ داران بھی فضلائے مدارس کے حق کی ہر پیش قدمی میں ساتھ نظر آئیں گے۔ اس سلسلے میں بڑے مدارس اپنے نظام پر کسی کی مداخلت برداشت کرنے کے لیے بالکلیہ تیار نہیں ہیں لیکن نصاب کی سطح پر باہمی غور وفکر ضرور کرنا چاہیے۔ اگر اس میں بھی کسی کی آن کو دھچکا لگ رہا ہو تو کم از کم ایک وفاق ایسا ضرور بنانا چاہیے جو اسناد کی یکسانیت پر غور کرے اور فضلائے مدارس کی یونیورسٹیوں میں تعلیم اور ملازمت تک کے مسائل کو زیر بحث لائے۔ اگر بڑے مدارس جیسے دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء، جامعہ اشرفیہ مبارکپور، جامعۃ السلفیہ بنارس، جامعہ نظامیہ حیدرآباد، جامعۃ الفلاح بلریا گنج، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کی کوئی کمیٹی تشکیل پا جائے جو یونیورسٹیوں کے ذمہ داروں سے ربط وہم آہنگی پیدا کرے تو اس جانب مثبت پیش رفت ہو سکتی ہے۔ امید ہے کہ ہماری ان چند گزارشات پر اہل مدارس بھی غور کریں گے اور یونیورسٹیوں کے ذمہ داران بھی۔ ❑❑

رفیع احمد قدوائی

تحریک عدم تعاون کے عظیم رہنما

تحریر محمد مظفر صادق

رفیع احمد قدوائی کا شمار کانگریس کے بڑے مسلم رہنماؤں میں ہوتا ہے جنھوں نے پنڈت جواہر لعل نہرو کے دورِ وزارتِ عظمیٰ میں کیبنٹ منسٹر کی حیثیت سے مختلف خدمات انجام دیں۔ وہ پیشے سے وکیل تھے مگر کبھی وکالت نہیں کی۔ ملک کے آزاد ہونے سے اپنی موت تک وہ مرکز میں وزیر رہے، لیکن ان کے نہ رہنے پر ان کی بیوی اور بچوں کو اتر پردیش میں بارہ بنکی کے اس ٹوٹے پھوٹے آبائی گھر میں واپس لوٹ جانا پڑا جہاں دن میں سورج کی روشنی اور رات میں چاندنی کمرے کو روشن کرتی تھی یعنی اس کا چھجا تک ٹوٹا ہوا تھا۔ رفیع صاحب اپنی فیملی کو راجدھانی میں ایک گھر بھی نہیں دے گئے تھے، انھوں نے اقدار اور اخلاقیات سے کبھی بھی سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔

اتر پردیش کے بارہ بنکی ضلع کے مسولی میں رفیع احمد قدوائی کی پیدائش ۱۸ر فروری ۱۸۹۴ء میں ہوئی تھی۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج سے انھوں نے ۱۹۱۸ء میں گریجویشن کی ڈگری حاصل کی اور آگے قانون کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن مہاتما گاندھی کی اپیل پر تعلیم ترک کر کے تحریک عدم تعاون میں شریک ہو گئے۔ اس شراکت داری کے لیے انھیں قید کی صعوبت بھی جھیلنی پڑی۔ ان کے اندر تنظیمی صلاحیت بے پناہ تھی۔ یہی سبب ہے کہ جواہر لعل نہرو نے انھیں الٰہ آباد بلایا اور اپنا ذاتی سکریٹری منتخب کیا۔

۱۹۳۰ء میں جب رائے بریلی کے غریب کسان ٹیکس ادا کرنے کے لائق نہیں تھے تو رفیع احمد قدوائی نے ان کے حق میں تحریک چلائی جس کے لیے انھیں انگریزی حکومت نے چھ مہینے قید کی سزا سنائی۔ اس کے باوجود وہ غریب ہندوستانیوں کے حق میں آواز بلند کرتے رہے۔ ۱۹۳۷ء میں صوبائی انتخاب ہوا اور کانگریس کو فتحیابی ملی تو اتر پردیش میں گووند ولبھ پنت کی کابینہ میں رفیع احمد کو آمدنی اور جیل کا وزیر بنایا گیا۔ ۱۹۵۶ء میں انھیں اتر پردیش کا وزیر داخلہ بھی بنایا گیا۔ ملک کی آزادی کے بعد ان کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے جواہر لال نہرو نے انھیں وزیر مواصلات کا عہدہ دیا۔ رفیع احمد قدوائی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جواہر لال نہرو کی کابینہ میں صرف دو مسلم شامل تھے، ایک رفیع احمد اور دوسرے مولانا ابوالکلام آزاد۔ ملک کے اس مجاہد آزادی کا انتقال ۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۴ء کو ہوا۔

حیرت انگیز فیصلے

رفیع احمد قدوائی نے وزیر رہتے ہوئے ایسے ایسے حیرت انگیز فیصلے کیے ہیں جن کو پڑھنے کے بعد کوئی بھی حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ ہندوستان پچاس کی دہائی میں غذائی بحران کا شکار تھا۔ امریکہ میں اُن دنوں غلہ اتنی بڑی مقدار میں پیدا ہوتا تھا کہ بہت سا غلہ یا تو جلا دیا جاتا تھا یا دریا میں بہا دیا جاتا تھا۔ امریکہ کے ایک سینیٹر نے تجویز رکھی تھی کہ ایسے فاضل غلے کو ہندوستان بھیج دیا جائے جہاں اجناس کی قلت ہے، اور تو اور سعودی عرب نے امداد کے طور پر کھجور بڑی تعداد میں روانہ کیے تھے۔ ان دنوں کے ایم منشی ہمارے وزیر زراعت تھے، انھوں نے تجویز رکھی تھی کہ عوام ہفتے میں ایک دن برت رکھیں، ایسے میں رفیع احمد قدوائی کو زراعت کا قلمدان دیا گیا۔ رفیع احمد قدوائی نے زراعت کا قلمدان سنبھالا اور اتنے کامیاب ہوئے کہ چند ہی برسوں میں غذائی قلّت دور ہو گئی اور راشننگ برخاست ہو گئی۔ ملک کی غذائی صورتِ حال کا اندازہ لگا کر انھوں نے سب سے پہلے شکر ملوں کے مالکان اور منتظمین اور تھوک تاجروں کو بلوایا اور ان سے پوچھا کہ سال بھر میں کتنی شکر ملک کو مہیا کر سکتے ہیں۔ انھوں نے جو اعداد و شمار دیئے وہ قدوائی صاحب کے گوشواروں سے بہت کم تھے۔ انھوں نے مل مالکوں اور غلہ کے تاجروں کو اپنے اعداد و شمار پر نظر ثانی کرنے کی مہلت دی۔ نتیجہ تب بھی کچھ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ قدوائی صاحب نے تب انھیں بتایا کہ اگر ملک خود ضروری مقدار میں شکر بازار میں نہیں لا سکتا تو دوسرے ملکوں سے درآمد کرنے پر مجبور ہوگا۔ ایک بار پھر مہلت دی گئی، مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ تب قدوائی صاحب نے اپنی وزارت کے سکریٹریوں کو بلوایا اور کہا: ''نئی دُنیا کی سیر کرنا چاہتے ہو؟'' سوال بہت حیران کن تھا۔ قدوائی صاحب کا لہجہ بھی مذاق کا نہیں تھا۔ انھوں نے ایک اعلیٰ سطحی وفد تشکیل دے کر اسے ہدایت کی کہ امریکہ جاؤ، وہاں گھومو پھرو اور وہاں کے شکر بازوں سے بات چیت کرتے رہو۔ ان سے شکر خریدنے کا کوئی وعدہ نہ کرو مگر بات چیت کی خبریں روزانہ ہندوستان پہنچتی رہیں۔ ان خبروں پر قدوائی صاحب کی وزارت مزید روغن چڑھا دیتی تھی۔ ہفتہ بھر نہ گزرا تھا کہ مل مالکوں نے خود ملاقات کی درخواست کی۔ ملاقات ہوئی اور اس میں اتنی شکر پیدا کرنے کے وعدے کیے گئے جو قدوائی صاحب کے اندازوں سے قریب تھے۔ وفد خاموشی سے امریکہ کی سیر سے واپس آ گیا اور ملک میں اچانک شکر کھلے عام ملنے لگی۔ پھر قدوائی صاحب نے اعلان کیا کہ راشن کا سسٹم ختم۔ تمام غذائی اجناس کھلے بازار میں ملیں گی۔ نہرو جی کی کابینہ میں وزیروں نے بہت واویلا مچایا، غذائی نظام کے منہدم ہونے اور بھگمری پھیلنے کا ڈر پھیلایا، مگر نہرو جی نے انھیں ڈانٹ دیا۔ راشم ختم ہوا تو لیجیے، ہر چیز ملنے لگی۔

عظیم کارنامے

اسی طرح وزیر مواصلات یعنی پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف کے وزیر کی حیثیت سے بھی وہ بہت کامیاب رہے تھے۔ جب ڈاک کا محکمہ ان کے ماتحت تھا تو انھوں نے اس میں تین یادگار کام کیے۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان کے ہر ایسے شہر میں جہاں ہوائی اڈہ تھا ڈاک پہنچانے کا انتظام ریل کے بجائے رات کو چلنے والے ہوائی جہازوں سے کر دیا چنانچہ ہفتہ دس دن میں ملنے والے خطوط دوسرے یا تیسرے دن ملنے لگے۔ پھر ان بڑے ہوائی شہروں سے قریبی چھوٹے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کی ڈاک کو مربوط کر دیا گیا تو وہاں بھی خطوط کی ترسیل میں تیزی آ گئی۔ دوسرا کام ہندوستان میں اِن لینڈ نامی لفافہ قدوائی صاحب کا جاری کیا ہوا تھا۔ یہ ذاتی تجربہ کی بات تھی۔ آج کا سیاستداں زندگی سے دور رہتا ہے اس لیے اس بے چارے کو کوئی نہیں بتاتا کہ جنتا کی تکلیف کیا ہے۔ ویسے بھی جب سے ہندوستانی نوکریاں سعودی مملکت اور خلیجی چرواہوں کے نخلستانوں میں ملنے لگیں اور امریکی نوکریاں بھارت میں تو خیال یہی ہے کہ جنتا کو اب کوئی تکلیف نہیں رہ گئی۔ اب وہ دلّی کے جن پتھ پر مل جاتا ہے۔ اسی لیے جنتا کی تکلیفوں کے تجربوں کا کچھ رواج اس پرانے زمانہ میں تھا مگر اس زمانہ میں بھی وہ بس ایسا ہی تھا جیسے کسی کو ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق ہو۔ اب ہر بچہ تو ڈاک ٹکٹ جمع نہیں کرتا، تو ہر وزیر بھی ایسا فضول شوق نہیں پالتا تھا کہ موقع ہو نہ ہو جنتا کی تکلیفیں یاد کر کے اپنا دل کڑھاتے رہو۔

قدوائی صاحب ایک ذہین آدمی تھے۔ مختصر زندگی میں ہم جیسے لوگ شاعری کرتے ہیں، قدوائی صاحب شاعری نہیں کرتے تھے، ہاں شاعری میں جس دُکھ درد کا بیان کبھی کبھی ہوتا ہے اسے خوب سمجھتے تھے۔ اس کے لیے فقط زبانی تحسین آفرینی کی نہیں، ایک دل دردمند کی ضرورت ہوتی ہے۔ قدوائی صاحب کے پاس تحسین کرنے والی زبان کے ساتھ وہ دل دردمند بھی تھا اور اس درد کو جذبہ بنا دینے کا سلیقہ بھی انھیں آتا تھا۔

جدید ہندوستان میں میراث

۱۹۵۶ء میں حکومت ہندوستان نے رفیع احمد قدوائی کے نام پر زرعی میدان میں ایک ادارہ آئی سی اے آر کے تحت محققین کے لیے ایک ایوارڈ کا انعقاد کیا۔ یہ ایوارڈ ہر دوسرے سال تمغے اور نقد رقم کی شکل میں دیا جاتا ہے۔ نومبر ۲۰۱۱ء میں ہندوستان کی حکومت نے رفیع احمد قدوائی نیشنل پوسٹل اکیڈمی قائم کی جو آگے چل کر پوسٹل اسٹاف کالج، غازی آباد کی شکل اختیار کیا۔ نیشنل اکیڈمی کمیشن کی طرف سے سول

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ

جو تحریک آزادی کا ایک اہم کردار تھے

معروف صاحب طرز ادیب و مورخ ملا واحدی کی ایک نابغۂ روزگار تحریر

سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب کا سن پیدائش ۱۳۰۶ء ہے۔ یہ خود مولانا مرحوم نے ہی راقم الحروف کو بتایا تھا۔ فرماتے تھے کہ دن اور تاریخ معلوم نہیں مگر مہینہ ربیع الثانی کا تھا۔ ازروئے تقویم یہ دسمبر ۱۸۸۸ء کے مطابق ہے۔ یکم ربیع الثانی ۱۳۰۶ء کو ۵؍ دسمبر ۱۸۸۸ء ہوتی ہے۔ شمسی حساب سے پیدائش کا مہینہ بھی دسمبر ہے اور وفات کا بھی دسمبر اس حساب سے اکہتر سال کی عمر پائی۔ اور قمری حساب سے تہتر سال سے کچھ زائد عمر پائی۔ مولد ومنشا کوچہ ناہر خاں دریا گنج دہلی ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم مولوی عبدالمجید مصطفیٰ آبادی سے حاصل کی۔ اور تکمیل حفظ قرآن کی دستار بندی مدرسہ حسینیہ بازار مٹیا محل میں ہوئی۔

مدرسہ حسینیہ کو ۱۳۲۲ء-۱۹۰۴ء میں مولانا محمد حسین فقیر رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادوں مولانا محمد ابراہیم وغیرہ نے شیخ کریم بخش ساکن ترکمان دروازہ اور دیگر مسلمانوں کے چندہ سے تعمیر کیا تھا۔ وہاں مولانا محمد حسین فقیرؒ کا وعظ ہوتا تھا۔ غالباً ۱۳۲۳ھ میں ان کی وفات ہوئی تو ان کے صاحبزادے مولانا محمد ابراہیم کا وعظ ہوتا تھا۔ اس زمانے میں مولانا احمد سعید کی عمر ۱۶-۱۷ برس کی ہوگی۔ آپ مولانا فقیرؒ کے اور ان کے بعد مولانا راسخ اور مولانا محمد ابراہیم کے وعظ سنتے تھے۔

جب آپ مولانا راسخ کے وعظ سنتے تھے چونکہ آپ کے اندر فطرۃً جوہر قابل موجود تھا، وعظ سنتے سنتے خود بھی وعظ کہنے لگے۔ علمی قابلیت حفظ قرآن سے آگے نہ تھی۔ لکھنا بھی غالباً نہیں آتا تھا۔ مدرسہ حسینیہ میں مولانا محمد ابراہیم کا اور مدرسہ حسین بخش میں مولانا کرامت اللہ خاں کا وعظ ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں وعظ وتذکیر کا طریقہ عصر حاضر سے کچھ مختلف تھا۔ لوگ اپنے گھروں میں وعظ اور مولود شریف کی محفلیں منعقد کیا کرتے تھے۔ وہ محض محفلیں ہی ہوتی تھیں ان کو جلسہ نہیں کہا جا سکتا، اور غالباً لفظ جلسہ جو مفہوم اب رکھتا ہے وہ اس زمانے میں نہیں تھا۔ کیونکہ ان محفلوں کے لیے عام پوسٹر شائع نہیں کیے جاتے تھے۔ صرف محلے میں زبانی اعلان کرا دیا جاتا تھا۔ یا کچھ مسجدوں میں خاص خاص علماء کا وعظ مقرر تھا۔

شروع شروع میں مولانا کو ایسی ہی محفلوں میں بلایا جاتا تھا۔ بعد میں کوچہ چیلان کی مسجد جو آب مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ کی مسجد کہلاتی ہے اس میں بھی مولانا نے ہر جمعرات کو وعظ کہنا شروع کیا۔ ایک مرتبہ مولانا نے فرمایا۔ ”بھئی! ہماری زندگی تو شروع سے ہی قلندرانہ زندگی ہے۔ جب ہم کسی کے گھر پر جا کر وعظ کہتے تھے تو دو روپے نذرانہ ملتا تھا۔ کچھ تارکشی کا کام کر لیتے تھے اس طرح عسرت کے ساتھ گزر بسر ہوتی تھی۔“

تارکشی کا یہ محنت طلب طریقہ آپ کے والد بھی یہ کام کرتے تھے۔ مولانا کا نوعمری کا زمانہ تھا جبکہ آپ کے والد کی وفات ہوگئی اور متعلقین کی کفالت کا بار آپ کے ہی کندھوں پر آ گیا۔

غالباً ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۰ء تک کا زمانہ تھا جبکہ مولانا کی عمر بیس بائیس برس کی ہوگی۔ آپ بھی کبھی کبھی فوارہ پر تقریر کرتے تھے۔ سامنے نواب روشن الدولہ کی سنہری مسجد میں مدرسہ امینیہ تھا۔ اور حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ اس کے صدر مدرس تھے۔ مدرسے کے طلبہ بھی ان تقریروں میں آ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ انھیں میں سے حضرت مفتی اعظمؒ کے ایک ہونہار ذی استعداد اور منتہی شاگرد مولانا قاری حافظ محمد یاسین سکندرآبادی بھی تھے۔ یہ مدرسہ حسینیہ میں بھی کبھی کبھی چلے جاتے تھے اور مولوی احمد سعید سے واقف تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے ایک مرتبہ مولانا احمد سعید کی تقریر کی تعریف سنی تو اپنے شاگرد سے کہا کہ اس نوجوان واعظ سے کسی وقت پوچھنا کہ اس نے کہاں پڑھا ہے اور کہاں تک پڑھا ہے؟ قاری صاحب موصوف وعظ میں شریک ہوتے ہی تھے ختم ہونے پر نوجوان واعظ کے ساتھ ہو لیے۔ راستے میں پوچھا کہ مولوی صاحب! آپ نے کہاں پڑھا ہے؟ قاری صاحب موصوف ایک طالب علم تھے اور نوجوان واعظ کو کم سے کم دارالعلوم دیوبند کا فاضل ترین فیض یافتہ خیال کرتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی محسوس نہیں کیا تھا کہ استاد محترم نے یہ خدمت کیوں میرے سپرد کی ہے؟

غرض کہ مولانا نے قاری صاحب کو اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُلجھا دیا اور اصل بات کا جواب نہیں دیا۔ دوسرے دن پھر پوچھا مگر بات کو پھر ٹال دیا گیا۔ وہ ٹالتے رہے وہ پوچھتے رہے اور آخر نوجوان واعظ نے ایک دن یہ جواب دیا کہ ”مولوی صاحب آپ یہ بات پوچھتے ہیں تو مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔ کہیں پڑھا ہو تو بتاؤں۔ بھئی میں نے تو کہیں نہیں پڑھا اور کچھ نہیں پڑھا۔ البتہ پڑھنے کی آرزو ہے۔“ قاری صاحب موصوف کو یقین نہیں آیا۔ لیکن کچھ عرصے میں تعلقات بڑھے۔ زیادہ میل جول ہوا تو قاری صاحب کو معلوم ہو گیا کہ واقعی یہ اَن پڑھ ہیں۔ پھر انھوں نے مولانا کو رائے دی کہ آپ مدرسہ امینیہ میں داخلہ لے لیجیے اور علم حاصل کیجیے۔ مولانا نے کہا کہ بھئی مولوی صاحب! میں کیونکر پڑھ سکتا ہوں۔ والد کے انتقال کے بعد سے گھر بار کا سارا بوجھ مجھ پر ہے۔ شادی بھی ہو چکی ہے۔ دن بھر محنت کرتا ہوں جب کہیں جا کر کام چلتا ہے اور آذوقہ نصیب ہوتا ہے ان حالات میں داخلہ لے کر پڑھنے کی فرصت کہاں؟ مگر اُن کو پڑھانا اور ان کو پڑھنا مقدر تھا۔ قاری صاحب نے اپنے استاد محترم سے اجازت لے کر مولانا کے گھر جا کر رات کے وقت پڑھانا شروع کر دیا۔ مگر چونکہ اس صورت میں قاری صاحب کا ہرج ہوتا تھا وہ خود بھی پڑھتے تھے۔ اس لیے مولانا سنہری مسجد میں ہی جا کر رات کو ان سے پڑھنے لگے۔ ہوتا یہ تھا کہ دن میں مولانا مال تیار کر کے شام کو فتحپوری بازار کے دو کانداروں کو دیتے ہوئے سنہری مسجد میں آ جاتے تھے۔ اور سبق پڑھ کر گھر جاتے تھے۔ ایک سال تک قاری صاحب نے ان کو پڑھایا اور جب ابتدائی کتابیں نکلوا چکے تو باضابطہ مدرسہ امینیہ میں داخلہ کر دیا۔

مدرسے میں مولانا کا داخلہ شوال ۱۳۲۸ھ میں ہوا۔ اور شرح مائۃ عامل مفید الطالبین وغیرہ اسباق شروع ہوئے مولانا کی سند میں مندرجہ ذیل کتابیں درج ہیں: تفسیر جلالین، تفسیر بیضاوی، صحاح ستہ اور مشکوٰۃ شریف، نخبۃ الفکر، قدوری، کنزالدقائق، شرح وقایہ، ہدایہ اولین، ہدایہ اخیرین، اصول الشاشی، نوالانوار، توضیح تلویح، ایسا غوجی، مرقاۃ، شرح تہذیب، قطبی، ملاحسن، حمداللہ، مناظرہ رشیدیہ، ہدیہ سعیدیہ، میبذی، مختصر المعانی، مطول، شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو کافیہ، شرح جامی، مفید الطالبین، نفحۃ الیمن، قلیوبی، سبعہ معلقہ، دیوان متنبّی۔

مولانا فرماتے تھے کہ مدرسے کے علاوہ میں نے خارج وقت میں کچھ گھر پر کچھ مدرسے میں حضرت مفتی صاحب سے اور بھی کتابیں پڑھی ہیں۔ راقم الحروف کو ان کتابوں کے نام بھی بتائے تھے۔ ان میں سے صرف فتح الباری کا نام یاد ہے۔ جس کا آخری پارہ ملتان جیل میں پڑھا۔ مولانا کے دیگر اساتذہ حضرت مولانا حافظ محمد ضیاء الحق دیوبندی مرحوم مولانا محمد قاسم دیوبندی مرحوم۔ مولانا سید انظار حسین سہنسپوری مرحوم وغیرہ تھے۔

مدرسے میں باضابطہ داخلہ کے بعد تارکشی کا کام چھوٹ گیا تھا۔ اور وعظ وتبلیغ کے نذرانوں سے ہی گزر بسر ہوتی تھی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حضرت مفتی صاحب کے حکم سے وعظ کا نذرانہ لینا بالکل بند کر دیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد کٹرہ ہدو محلّہ فراش خانہ کی مسجد میں آپ نے ترجمہ قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ روزانہ صبح کو آپ وہاں جا کر ترجمہ بیان کرتے تھے۔ وہاں سے مبلغ ساٹھ روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ سرکار نظام سے مولانا کو مبلغ ۱۲۵ ماہانہ کا منصب بھی عطا ہوا تھا۔ جو کئی برس تک جاری رہا۔ مگر تحریک خلافت میں کھلم کھلا حصہ لینے کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مولانا کو حضرت مفتی صاحب نے بطور معین مدرس کے مدرسے میں مقرر کیا اور کچھ ابتدائی کتابیں پڑھانے کے لیے دے دیں۔ مولانا کئی سال تک مدرسے میں تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے اور ایک مربی کامل کی نگرانی میں یہ جوہر قابل جلا پاتا رہا۔ وہ علمی خزانہ جو اندر بھرا جا چکا تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اب مولانا کی تقریر اُڑائی ہوئی تقریر نہ تھی بلکہ ٹھوس مدلل مربوط ہونے کے ساتھ زبان کی لطافت وشیرینی اور فصاحت وبلاغت کا اُمنڈتا ہوا دریا تھا۔

یہ مناظروں کا دور تھا۔ اس دور میں مولانا نے زبردست اور معرکۃ الآراء مناظرے کیے۔ اس وقت آریوں میں بھی بڑے بڑے فاضل مناظر اور خطیب موجود تھے۔ پنڈت رام چندر دہلوی کا نہ صرف دہلی میں بلکہ ہندوستان بھر میں طوطی بول رہا تھا۔ قرآن مجید عمدہ پڑھتا تھا۔ اور بڑا طرار ولسّان تھا۔ مولانا نے اس سے بھی مناظرے کیے۔ اور مولانا کی خطابت سب پر غالب رہی۔ مولانا احمد سعید جب مناظرہ کرتے تھے تو ان کے معاون حضرت مفتی اعظمؒ ہوتے تھے۔ مولانا احمد سعید کی شیریں بیانی اور حضرت مفتی صاحب کی اعانت گویا سونے پر سہاگہ تھا۔ اس طرح مولانا نے بڑے بڑے میدان جیتے۔ ان مناظروں نے مولانا کے انداز بیان کو نقطۂ کمال پر پہنچا دیا تھا۔ مولانا کی ظرافت مناظرے میں بھی اپنا رنگ دکھاتی اور مجمع کو ہنساتی تھی۔

۱۹۱۹ء میں حضرت مفتی اعظمؒ نے جمعیۃ علمائے ہند کے قیام وتاسیس کے لیے دیگر علمائے ہند سے جو مذاکرت فرمائے ان میں آپ کے دست راست اور رفیق کار مولانا احمد سعید ہی تھے جو ہر ایک کام میں اور ہر ایک مجلس میں شریک رہتے تھے۔ مدرسہ امینیہ میں حضرت مفتی اعظمؒ کا جو خاص کمرہ تھا اسی میں پہلا دفتر قائم ہوا۔ اور وہیں بیٹھ کر یہ دونوں استاد شاگرد اس کے تمام ابتدائی امور انجام دیتے تھے۔ ہندوستان بھر کے تمام علماء کی مکمل فہرست مفتی صاحبؒ نے اپنے دست مبارک سے تحریر فرمائی۔

ملک میں دورے کر کے جماعت کو روشناس کرانا۔ اس کی سیاسی ضرورت واہمیت کو عوام کے ذہنوں میں جاگزیں کرانا۔ اس کے چلانے کے لیے مالی اعانت پر مسلمانوں کو تیار کرنا۔ لیڈروں سے سیاسی مذاکرے اور اشتراک عمل کرنا۔ ان ذمہ دارانہ کاموں کے ساتھ خود ہی دفتر کے کاروبار کو بھی چلانا۔ آمد و خرچ کا حساب کتاب رکھنا۔ لکھنا مرتب کرنا۔ تمام ہند اور بیرون ہند کے علماء واکابر سے خط وکتابت اور ربط قائم رکھنا۔ ڈاک تیار کرنا۔ رجسٹر پر چڑھانا، ڈاکخانہ کا کام انجام دینا وغیرہ۔ یہ تمام کام اور ان کے ملحقات حضرت مفتی صاحب اور مولانا احمد سعیدؒ کا تھا۔ مولانا احمد سعید نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ ”میاں مفتی صاحب! دفتر جمعیۃ کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے اس طرح چلایا ہے کہ حضرت تو حساب کتاب لکھتے تھے اور میں ڈاک تیار کر کے خود ڈاکخانہ لے جاتا تھا۔“

جمعیۃ علماء کے قیام کے بعد ملک میں سیاسی تحریکات نے زور پکڑا۔ رولٹ بل کے خلاف برہمی جو خلافت کی تحریک کے نام سے مشہور ہے اس میں جمعیۃ علمائے ہند کی زیر قیادت بھی مسلمانوں نے نمایاں حصہ لیا۔ اس وقت ہندو مسلمانوں کا اتحاد نقطۂ کمال تک پہنچا ہوا تھا۔ جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے بھی علماء اور عوام بے دھڑک جیلوں کو بھر رہے تھے۔ مولانا احمد سعید ان تحریکات کے سلسلے میں سب سے پہلی مرتبہ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں گرفتار ہو کر میاں والی جیل میں رہے۔ ایک سال قید بامشقت کی سزا ہوئی تھی۔ ۲۸؍ ستمبر ۱۹۲۲ء کو رہائی ہوئی۔ ان تمام تحریکاتِ آزادی میں مولانا کو آٹھ مرتبہ گرفتار کیا گیا۔ ۱۹۳۰ء کی تحریک میں اور پھر ۳۲ء کی تحریک میں حضرت مفتی اعظمؒ کے ساتھ گجرات جیل میں اور پھر ملتان جیل میں بھی رہے۔ ۱۲؍ فروری ۱۹۲۲ء کو جبکہ گاندھی جی نے بمقام باردولی سول نافرمانی کی تحریک کو معطل کر دیا، انگریزوں کو بڑی حد تک سکون نصیب ہوا۔ مگر ہندو مسلم اتحاد کی فضا قائم تھی اور انگریزوں کے دل میں یہ دُگدا رہتا تھا کہ اگر یہ دونوں متحد ہو کر پھر کوئی تحریک شروع کر دیں گے تو اب کے حکومت برطانیہ کی چولیں ہی ہل جائیں گی اور عزت سنبھالنی مشکل ہو جائے گی۔ چنانچہ جب گورنمنٹ نے ہندو مسلمانوں کے مشترک جلوسوں اور جلسوں کو دبانا چاہا تو اس کے خلاف بلوے ہوئے۔ اور ہندو مسلمان اور زیادہ متحد ہو گئے۔ اور یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ چوراچوری کے واقعہ کے بعد ۱۹۲۲ء میں وائسرائے نے ترک موالات کے ایک بڑے ہندو لیڈر سوامی شردھانند کو جو اس وقت جیل میں تھے بلا کر گفتگو کی اور اس گفتگو کے بعد جو صیغۂ راز میں رہی ان کو رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہی شردھانند نے شدھی کا کام شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر مونجے سنگٹھن قائم کی جو خالص ہندوؤں کی جماعت تھی۔

جمعیۃ علمائے ہند کی تاریخ میں یہ عہد بے انتہا نازک اور آزمائشی عہد تھا۔ ادھر تو ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد جس کے لیے ہندوستان کی تمام قوموں کا متحد ہونا ضروری تھا۔ دوسری طرف مسلمانوں کو ارتداد سے بچانا۔ غرض کہ انگریز کا یہ ایک ایسا بھرپور وار تھا جس نے پورا کام کیا اور ملک کی آزادی پچیس برس کے لیے مؤخر ہو گئی۔ اس وقت اکابر جمعیۃ کا فہم وتدبر سخت آزمائش میں تھا۔ ملک کے چپے چپے پر ہندو مسلمانوں میں فساد اور خوں ریزی ہو رہی تھی۔ اللہ رب العزت ان اکابر کی روحوں پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے جنھوں نے ارتداد اور شدھی کا مقابلہ بھی پوری جواں مردی عالی ہمتی اور عزم راسخ کے ساتھ کیا اور وطن کی آزادی کے لیے بھی لڑتے رہے۔ خدا رحمت کند آں عاشقانِ پاک طینت را۔

سوامی شردھانند نے شدھی کی تحریک ملکانوں کے علاقے سے شروع کی تھی۔ اور ہزارہا ملکانوں کو مرتد کر دیا تھا۔ اس زمانے میں حضرت مفتی اعظمؒ جمعیۃ علماء ہند کے صدر اور مولانا احمد سعید ناظم اعلیٰ تھے۔ حضرت نے جمعیۃ علماء اور مدرسہ امینیہ کی طرف سے بھی بے شمار تبلیغی وفود مرتدین کے علاقوں میں بھیجا۔ اور سب سے پہلا وفد تو غالباً خود ہی اچھنیرے کے مقام پر لے کر گئے تھے۔ مولانا محمد حسن دوحدی جو اُس وقت معین مدرس تھے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب وفد لے کر گئے گاؤں میں پہنچ کر ایک جگہ زمین پر رومال بچھا کر بیٹھ گئے۔ وفد میں مولانا دوحدی کے علاوہ دو تین طالب علم تھے۔ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت یہ جگہ تو مناسب نہیں ہے۔ فرمایا کہ چپکے رہو۔ اسی میں عافیت ہے۔ گاؤں والے چند طلبہ کو دیکھ کر جمع ہو گئے۔ پھر آپ نے تقریر فرمائی۔ ان وفود کے صدر کبھی حضرت مولانا وحید حسن خاں ٹونکی مرحوم مدرس مدرسہ امینیہ اور کبھی مولانا محمد عرفان مرحوم نائب ناظم جمعیۃ علمائے ہند و مدیر اخبار الجمعیۃ اور کبھی مولانا احمد سعید اور کبھی دیگر حضرات ہوتے تھے۔ مرتد ملکانوں کے علاقوں میں جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ قدم قدم پر فتنہ وفساد کا اندیشہ اور جان کا خطرہ لگا رہتا تھا۔

ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب کے پاس خبر پہنچی کہ فلاں گاؤں پورا کا پورا مرتد ہو گیا ہے۔ حضرت نے مولانا احمد سعید کو حکم دیا کہ فوراً روانہ ہو جاؤ۔ وہ گئے۔ حالات معلوم کیے اور خاص کر یہ بات دریافت کی کہ آریہ لوگ آ کر ان گاؤں والوں سے کیا کہتے ہیں؟ اور کیونکر بہکاتے ہیں؟ بتایا گیا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ”تمھارے باپ دادا سب ہندو تھے۔ مسلمانوں نے آ کر تم کو زبردستی مسلمان بنایا۔ اور تمھاری چوٹیاں کاٹیں۔“ اب مولانا کا طرز استدلال اور شان خطابت ملاحظہ فرمایئے۔ آپ نے جلسے کا اعلان کرایا۔ اور کھڑے ہو کر فرمایا: ”آج اس گاؤں میں آ کر اور ایک بہادر قوم کے سپوتوں سے مل کر میں بے انتہا خوش ہوا ہوں۔ ملکانہ قوم دنیا کی چند بہادر قوموں میں سے ایک ممتاز قوم ہے۔ یہ قوم ہندوستان کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ تمھارے باپ دادا نے ہمیشہ ہندوستان کی حفاظت کی ہے۔ دشمنوں سے کبھی ہار نہیں مانی ہے۔ اور بھئی! مجھے ان لوگوں پر بڑی حیرت ہوتی ہے جو تمھارے باپ دادوں کو تمھارے منہ پر بزدل اور ڈرپوک کہتے ہیں اور تم جواُن سورماؤں کی اولاد ہو سنتے ہو اور بُرا نہیں مانتے۔ لوگ تمھیں آ کر بہکاتے ہیں کہ تمھارے باپ دادوں کو مسلمانوں نے مار مار کر زبردستی مسلمان بنایا تھا۔ اور ان کی گردنیں پکڑ پکڑ کر چوٹیاں کاٹ ڈالی تھیں۔ کیا واقعی تمھارے باپ دادا ایسے ہی کمزور اور ڈرپوک تھے؟ مجھے یقین نہیں آتا! دیکھو بھئی! یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ دھوکا دیتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تمھارے باپ دادوں سے کوئی آنکھ بھی نہیں ملا سکتا تھا۔ وہ اسلام کو ایک اچھا اور سچا دین سمجھ کر اپنی خوشی سے مسلمان ہوئے تھے۔ کیا اب تم اپنے سچے دین کو چھوڑ کر اپنے باپ دادوں کی روحوں کو صدمہ نہیں پہنچا رہے ہو؟“

تقریر ختم ہونے کے بعد گاؤں کے لوگ ازسرنو مسلمان ہو گئے۔ آپ کی طرز خطابت کے ایسے ہی سینکڑوں کرشمے اکثر ظہور پذیر ہوتے رہتے تھے۔ جن سے ذہنیت اور خیال بدل جاتے تھے۔ فتنہ وفساد کے عزائم سست پڑ جاتے تھے۔

بریلی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں کوئی کانفرنس ہو رہی تھی۔ اس کو خراب کرنے کے لیے کئی سو آدمی اپنی بغلوں میں چھرے چاقو چھپا کر آئے تھے۔ مولانا احمد سعید صاحبؒ نے کھڑے ہو کر تین گھنٹے تقریر کی۔ فسادیوں کے مفسدانہ عزائم پر اوس پڑ گئی۔ کوئی چوں بھی تو نہ کر سکا۔ کانفرنس امن وعافیت کے ساتھ جاری رہی۔ تقریر کے ختم ہونے کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد جیسے آتش بیان خطیب نے اُٹھ کر مولانا کو گلے لگایا اور فرمایا کہ ”مولانا اگر آپ ہمیشہ ایسی ہی تقریر کیا کرتے ہیں تو دنیائے اسلام میں آپ کا جواب نہیں ہے۔“

نومبر ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علمائے ہند قائم ہوئی تھی۔ اس کی صدارت کے لیے حضرت مفتی اعظمؒ کو اور نظامت کے لیے حضرت مولانا احمد سعید کو منتخب کیا گیا تھا۔ جب ان حضرات کی محنت شاقہ سے جمعیۃ نہ صرف ہندوستان وبرما میں بلکہ تمام دنیائے اسلام میں روشناس ہو گئی۔ اور اس پودے کی پھلنگ آسمان سے باتیں کرنے لگی اور اس کی جڑیں مضبوط ہو گئیں تو بعض حضرات کے دلوں میں یہ خلش پیدا ہوئی کہ تمام ہندوستان کے مختلف الخیال اور مختلف المسلک علماء کی باگ ڈور دیوبندی حضرات کے ہاتھ میں کیوں ہے؟ ۱۹۲۲ء-۱۳۴۱ھ میں جبکہ جمعیۃ علماء کی سالانہ کانفرنس شہر گیا میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی زیر صدارت منعقد ہوئی تھی۔ اس وقت سے اس قلبی خلش کا اظہار ہونے لگا تھا، مگر جن ایثار پیشہ اور مخلص علماء نے مل کر جمعیۃ کی بنیاد ڈالی تھی وہ اس کے اندر اختلاف کو گوارا نہ کر سکتے تھے۔ بہرحال ۱۹۳۹ء میں جمعیۃ کی صدارت حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اور نظامت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاریؒ کی طرف منتقل ہو گئی۔ حضرت شیخ کی وفات کے بعد مولانا کو صدر چنا گیا اور تادم واپسیں تک آپ جمعیۃ

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

ماضی کے جھروکے سے

تاریخ ہند کا ایک ورق

ابوالمحاسن مولانا محمد سجادؒ

جو جمعیۃ علماء ہند کے پالیسی سازوں میں ایک اہم مقام کے حامل تھے

تحریر: مولانا محمد یٰسین جہازی (جمعیۃ علماء ہند)

ضبط شدہ معابد اور اوقاف کو واگذاشت کرانے کی جدوجھد

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نور اللہ مرقدہ نے مساجد و اوقاف پر حکومت کے ناجائز قبضہ کے خلاف زبردست جدوجہد کی۔ مسلم اراکین اسمبلی کو خط لکھ کر متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ علاوہ ازیں ۱۳؍ستمبر ۱۹۳۲ء کو اسمبلی کے ارکان سے اپنے فرض کی ادائیگی کی اپیل کرتے ہوئے یہ بھی اپیل کی کہ تمام مقبوضہ مساجد اور اوقاف کے فوٹو بھی حاصل کیے جائیں۔

''ایسٹ انڈیا کمپنی یا اس کے بعد جتنی مساجد اور اوقاف پر حکومت کا قبضہ ناجائز ہے، ان کو آئینی طور پر واگذاشت کرانے کے لیے ممبران اسمبلی کے نام میں ایک اپیل شائع کر چکا ہوں۔ امید ہے کہ وہ حضرات اس پر خاص توجہ کریں گے۔ اور اگر انھوں نے غفلت کی تو سمجھا جائے گا کہ وہ اسمبلی میں پبلک کی نمائندگی اور ملت کی خیر خواہی کے لیے نہیں جاتے۔ اور اس صورت میں بہت ممکن ہے کہ آئندہ انتخابات میں یہی غفلت ان کی راہ میں مشکلات پیدا کردے۔'' (الجمعیۃ ۱۳؍ستمبر ۱۹۳۲ء)

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کو نوٹس

''حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کو ۵؍ستمبر ۱۹۳۲ء کی رات سوا گیارہ بجے، آرڈی نینس اختیارات خصوصی کی دفعہ ۵۴ کے ماتحت ایک نوٹس دیا گیا کہ چوبیس گھنٹے میں دہلی کو چھوڑ دیں اور پھر آئندہ نوٹس تک آپ دہلی واپس نہ آئیں۔ نوٹس میں یہ بھی لکھا تھا کہ ''اس نوٹس کی خلاف ورزی پر دو سال قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جا سکتی ہیں۔ آپ کو یہ نوٹس جامع مسجد کی آزادی قائم رکھنے اور مجلس تحفظ ناموس شریعت کی طرف سے مسودات حج کے متعلق آپ کی سرگرمیوں کو روکنے کے لیے جاری کیا گیا۔ (الجمعیۃ ۵؍ستمبر ۱۹۳۲ء)

رکن مجلس عاملہ منتخب

۲۹؍فروری تا ۲؍مارچ ۱۹۳۲ء کی مجلس عاملہ میں مجلس عاملہ کو توڑ کر کل اختیارات حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کے حوالے کردیے گئے تھے۔ اور پھر ڈکٹیٹری کا سلسلہ قائم کیا گیا تھا۔ دسویں ڈکٹیٹر جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اختیارات سے مجلس عاملہ کی عارضی نامزدگی کی۔ سولہ اراکین میں ایک نام آپ کا بھی شامل تھا۔ (الجمعیۃ ۹؍دسمبر ۱۹۳۲ء)

دائرہ حربیہ کا اختتام

بارہویں ڈکٹیٹر کے بعد ۱۹-۲۰-۲۱؍اگست ۱۹۳۳ء کو مرادآباد میں جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس ہوا، جس میں سول نافرمانی کی تحریک کو ملتوی کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے، دائرہ حربیہ یا مجلس حربی کے اس نظام کو بند کردیا گیا۔ اور آئندہ کے لیے عملی پروگرام مرتب کرنے کی غرض سے ایک چار رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی، جس میں آپ کا نام بھی شامل تھا۔ (جمعیۃ علما کیا ہے، جلد دوم، ص ۱۷۷)

لکھنو یونی بورڈ میں شرکت

۱۰-۱۱-۱۲؍اگست ۱۹۳۴ء کو مرادآباد میں جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا ایک اہم اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب، مولانا بشیر احمد صاحب، مولانا احمد سعید صاحب اور مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کے ساتھ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کو لکھنؤ یونٹی بورڈ کے جلسہ مجوزہ ۱۹؍اگست ۱۹۳۴ء میں جمعیۃ کی جانب سے شریک ہوکر انتخابات میں یونٹی بورڈ کے امیدواروں کی تائید اور عدم تائید کا فیصلہ کرنے کا پابند بنایا۔ چنانچہ ان اکابرین کے ساتھ آپ نے بھی شرکت کی اور جمعیۃ کے فیصلے کے مطابق یونٹی بورڈ کو فیصلہ کرنے پر مجبور کیا۔

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء اور جمعیۃ کی تنقید

اس ایکٹ میں ہندستانی فیڈریشن، وہ ہندستانی صوبے جات جن سے مل کر فیڈریشن بنائیں گی اور برما کے متعلق تفصیلی بحث کی گئی تھی۔ اس میں گورنر جنرلوں کو بے پناہ اختیارات دے دیے گئے اور وزیروں کو صرف مشورہ دینے کا حق دیا گیا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: الجمعیۃ یکم فروری ۱۹۳۵ء) اس ایکٹ میں بھارتیوں کو کوئی بھی اختیار نہیں دیا گیا تھا، حتیٰ کہ مذہبی امور بھی گورنر جنرل کے اختیار میں دے دیا گیا تھا: ''خارجی تعلقات، دفاعی ماور اور مذہبی معاملات میں گورنر جنرل کو خاص الخاص ذمہ داری حاصل ہوگی۔ لیکن گورنر جنرل ان امور کی انجام دہی کے لیے مشیر مقرر کرے گا، جن کی تعداد تین سے زیادہ نہ ہوگی، جن کی تنخواہ و شرائط ملازمت ملک معظم باجلاس کونسل مقرر کریں گے۔'' (الجمعیۃ ۵؍فروری ۱۹۳۵ء)

> **بارہویں ڈکٹیٹر کے بعد ۱۹-۲۰-۲۱؍اگست ۱۹۳۳ء کو مرادآباد میں جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس ہوا، جس میں سول نافرمانی کی تحریک کو ملتوی کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے، دائرہ حربیہ یا مجلس حربی کے اس نظام کو بند کردیا گیا۔ اور آئندہ کے لیے عملی پروگرام مرتب کرنے کی غرض سے ایک چار رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی، جس میں آپ کا نام بھی شامل تھا۔**

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ نے اس بل پر زبردست تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ: ''ہندستانی مسلمانوں کے لیے مذہبی تحفظات کا کوئی اور طریقہ سوائے اس کے ممکن ہی نہیں تھا کہ دستور اساسی میں مستقل دفعات کو بنیادی حقوق کے ماتحت درج کرایا جاتا اور جیسا کہ ابھی عرض کیا جاچکا ہے تمام اسلامی جماعتوں نے اس مطالبہ کو متفقہ حیثیت سے پیش بھی کیا تھا؛ مگر حکومت برطانیہ کے مدبرین نے اس مطالبہ کو مسترد کرکے ہندستان کے اندر قانون کی دستبرد سے مذہب کو آزاد رکھنے کے تمام امکانات کو ختم کردیا اور اب جب کہ پارلیمنٹری رپورٹ کی سفارشات کے مطابق جدید دستور اساسی مرتب ہوکر ہمارے سامنے آچکا ہے، اور ہم ان مباحث و دلائل کا نتیجہ بھی دیکھ رہے ہیں، جو مذکورہ رپورٹ میں خاص طور پر بیان کیے گئے ہیں، ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ آٹھ کروڑ مسلمانان ہند کی یہ خواہش کہ ان کے مذہب میں کسی قسم کی آئینی مداخلت نہ کی جائے، اور اس اصول کو صاف الفاظ میں دستور اساسی کے اندر داخل کردیا جائے، پامال کردی گئی ہے۔'' (الجمعیۃ ۲۰؍جون ۱۹۳۵ء)

مولانا مرحوم اپنے اسی مضمون میں آگے لکھتے ہیں کہ: ''اگر بنیادی حقوق کی دفعہ کو دستور میں داخل کردیا گیا تو مداخلت مذہبی کا دروازہ کامل طور سے ہمیشہ کے لیے بند ہوجائے گا۔ کیا اس کے بعد بھی کسی کو شبہ ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی حیثیت سے آئین و دستور میں جو چیز ضروری تھی، وہ صرف بنیادی حقوق کی صراحت تھی، جس کے لیے جمعیۃ علماء ہند کے محترم ارکان ابتدا سے آواز بلند کررہے ہیں۔ مگر برطانوی حکومت کو منظور نہیں ہے؛ کیونکہ اس سے مذہبی مداخلت کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند ہوجاتا ہے۔'' (الجمعیۃ ۲۴ جون ۱۹۳۵ء)

کوئٹہ کے قیامت خیز زلزلہ میں امداد

۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کو کوئٹہ بلوچستان میں خطرناک زلزلہ آیا۔ ۵؍جون ۱۹۳۵ء کی الجمعیۃ میں چھپی خبر کے مطابق کوئٹہ کے قرب و جوار کا علاقہ بالکل نیست و نابود ہوگیا۔ بیس ہزار انسان ملبہ میں دب گئے۔ آتش فشاں پہاڑ پھٹ گیا۔ پہاڑیاں زمین میں دھنس گئیں۔ اس قیامت خیز تباہی سے متاثرین کی امداد و اعانت کے لیے آگے آئی۔ ایک طرف جمعیۃ کے صدر حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے لوگوں سے مدد کے لیے آگے آنے کے لیے اپیل کی، وہیں دوسری طرف بچشم خود حالات کا مشاہدہ کرنے کے لیے حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نور اللہ مرقدہ جائے حادثہ کا دورہ کیا اور راحت رسانی کی ہر ممکن کوشش کی۔

قانون فسخ نکاح کی تسوید

اجلاس مجلس مشاورت جمعیۃ مرکزیہ علمائے ہند، منعقدہ یکم و ۲؍فروری ۱۹۳۶ء میں آپ کا تیار کردہ قانون فسخ نکاح کا مسودہ کو منظور کرلیا گیا۔ اس مسودہ کے حوالہ سے پاس کردہ تجویز میں کہا گیا کہ ''جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ مسلمان عورتوں کی ان ناقابل برداشت مصائب پر نظر کرتے ہوئے۔ جن میں وہ مبتلا ہیں اور شرعی دار القضا نہ ہونے کی وجہ سے ان کا کوئی صحیح حل مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس مسودہ قانون کو منظور کرتا ہے۔ اور مسلم ارکان اسمبلی سے توقع رکھتا ہے کہ وہ علماء کی مشترک مجلس شوریٰ اور جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا منظور کردہ مسودہ اسمبلی میں پاس کرانے کی متحدہ قوت سے سعی کریں گے۔

درگاہ بل پر غور کمیٹی

اجلاس مجلس مشاورت جمعیۃ مرکزیہ جمعیۃ علماء ہند، منعقدہ یکم و ۲؍فروری ۱۹۳۶ء میں راجہ غضنفر علی خاں صاحب کے درگاہ بل پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، تو اس میں آپ کا نام بھی شامل تھا۔ (جاری)

گاھے گاھے باز خواں......

ہفت روزہ الجمعیۃ ۱۶ سال پہلے

ماضی کے جھروکوں سے حال پر روشنی ڈالتے ہوئے مستقبل کا اشاریہ!

ہفت روزہ **الجمعیۃ** نئی دہلی

۲۱؍تا ۲۷؍اکتوبر ۲۰۰۵ء

گجرات: وشوہندو پریشد کی طرف سے ایک بار پھر مسلمانوں کے بائیکاٹ کی دھمکی

۲۰۰۵ء میں نریندر مودی کے گجرات میں وشوہندو پریشد نے دھمکی دی تھی کہ اگر ۲۰۰۲ء کے فساد کے مجرمین کو گرفتار کرنے کا سلسلہ بند نہ کیا گیا تو وہ مسلمانوں کے سماجی بائیکاٹ کا اعلان کرنے کی کرے گی اس پر ہفت روزہ الجمعیۃ؟ کے مدیر تحریر ایم ایس جامعی نے ایک اداریہ تحریر کیا تھا جو حسب ذیل ہے۔

گجرات ہندستان کا اوّلین صوبہ ہے جو پوری طرح ہندوتو کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی آر ایس ایس کے وفادار سپاہی ہیں جو اس کی ہر آواز کو عملی شکل دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ آر ایس ایس کا یہ قدیم نظریہ ہے کہ ہندستان میں اقلیتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ یا تو ہندو آئیڈیالوجی کو قبول کرلیں اور یا پھر دوسرے درجہ کی شہریت قبول کرنے کے لیے تیار ہوجائیں۔ بصورتِ دیگر انھیں آزمائشوں سے گزرنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ آر ایس ایس نے اپنے اس نظریہ کو عملی شکل دینے کے لیے سب سے پہلے گجرات کا انتخاب کیا اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ اپنے اس مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوگیا ہے۔

گجرات میں جب سے اقتدار سنگھ کے وفادار نریندر مودی کے ہاتھوں میں آیا ہے سنگھ کی پوری کوشش ہے کہ وہاں اقلیتوں کو خوف و ہراس میں مبتلا رکھ کر انھیں قلب ماہیت پر مجبور کردیا جائے۔ ۲۰۰۲ء کا مسلم کش فساد بھی اسی کوشش کا ایک حصہ تھا جس میں تین ہزار سے زائد بے قصور اور نہتے مسلمانوں کو زندہ جلا کر موت کی آغوش میں سلا دیا گیا تھا۔ کھربوں روپے کی جائیدادیں لوٹی اور جلائی گئی تھیں اور طرفہ تماشا یہ کہ لاکھوں افراد کو ریلیف کیمپوں میں لاکر بے سہارا زندگی گزارنے پر مجبور کردیا گیا تھا اور آج آر ایس ایس کی ذیلی تنظیموں بالخصوص وشوہندو پریشد کی طرف سے گجرات کے مسلمانوں کے سماجی و معاشی بائیکاٹ کا اعلان بھی آر ایس ایس کے اسی منصوبہ کا ایک حصہ ہے۔

گجرات فسادات ۲۰۰۲ء کے بعد دادرسی اور انصاف کے نام پر مسلمانوں کو جو کچھ ملا وہ سب کے سامنے ہے۔ پہلے تو مودی حکومت کی یہ کوشش رہی کہ جس طرح بھی ہوسکے مسلمانوں کے قاتلوں کو بچایا جائے فسادات کے بعد مسلسل ایک سال تک کبھی تحقیقات کے نام پر اور کبھی انتظامیہ کو متاثر کرکے یہ مقصد حاصل کیا گیا اور جب حقوقِ انسانی کے تحفظ کی تنظیموں کے دباؤ اور بین الاقوامی دنیا میں بدنامی کے خوف سے عدالتی کارروائی شروع ہوئی تو اس میں چشم دید گواہوں کو ڈرا دھمکا کر یا پھر لالچ کے ذریعہ اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ گواہی نہ دیں یا پھر مجرموں کے حق میں گواہی دیں۔ گجرات کے فسادات کے مقدمات کی آج جو صورت حال ہے وہ مودی حکومت کی اس سازش کے لیے شاہد عدل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ذیلی عدالتوں نے گواہی اور ثبوت کے فقدان کی وجہ سے فساد کے بہت سے مجرموں کو یا تو باعزت بری کردیا ہے یا پھر وہ معمولی دفعات کے تحت مجرم گردانے جارہے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آر ایس ایس کی یہ تنظیمیں فسادات کے ان مجرموں کے خلاف ان معمولی معمولی کارروائیوں کے نام پر ہی گجرات بھر میں مسلمانوں کے سماجی و معاشی بائیکاٹ کی دھمکیاں دے رہی ہیں۔

۶؍اکتوبر ۲۰۰۵ء کے ''ہندستان ٹائمز'' کی ایک رپورٹ کے مطابق وشوہندو پریشد نے ایک بار پھر گجرات میں مسلمانوں کا سماجی و معاشی بائیکاٹ کرنے کی دھمکی دی ہے۔ پنچ محل اور داہود کے وشوہندو پریشد کے تنظیمی سکریٹری مسٹر شمبھو پرشاد شکلا نے اس سلسلہ میں پنچ محل کے ضلع مجسٹریٹ مسٹر برہم بھٹ کو ایک میمورنڈم دیا ہے جس میں ۲۰۰۲ء کے فسادات کے مجرمین کی گرفتاری پر احتجاج کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اگر ان فسادات سے متعلق مقدمات میں پارٹی کے کارکنوں کی گرفتاری کا سلسلہ بند نہیں کیا گیا تو وشوہندو پریشد مسلمانوں کے سماجی و معاشی بائیکاٹ پر مجبور ہوگی۔ مسٹر شکلا کا دعویٰ ہے کہ وشوہندو پریشد کے کارکنوں کو صرف مسلمانوں کے الزام لگانے کی بنیاد پر گرفتار کیا جارہا ہے جبکہ وہ پوری طرح بے قصور ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اب جبکہ عدالتوں کے ذریعہ خاص طور پر مقدمات کے سلسلہ میں عدالت عظمیٰ کے دلچسپی لینے کی وجہ سے مقدمات پر پڑی ہوئی سیاہ چادریں ہٹتی جارہی ہیں اور قاتلوں کے چہرے بے نقاب ہورہے ہیں۔ وشوہندو پریشد کے کارکنوں کی گرفتاری میں کچھ تیزی آگئی ہے جس کی وجہ سے وشوہندو پریشد اور پورا سنگھ پریوار بری طرح سے بوکھلا گیا ہے۔ گذشتہ دو ماہ کے دوران وشوہندو پریشد کے ایک سو سے زائد کارکنان صرف پنچ محل، داہور اور بڑودہ میں گرفتار ہوچکے ہیں جن میں بیس اس کے بڑے لیڈر بھی شامل ہیں۔ ان گرفتاریوں میں زیادہ تر کا تعلق ان ۲۳ مقدمات سے ہے جنھیں سپریم کورٹ کی ہدایت پر دوبارہ کھولا گیا ہے اور پہلے جن کے ملزمین یا تو ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے ذیلی عدالتوں سے باعزت بری کردیے گئے تھے اور یا پھر پولیس نے ہی ان فائلوں کو بند کردیا تھا۔

جہاں تک وشوہندو پریشد کی بائیکاٹ کی دھمکی کا تعلق ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، وہ اس سے پہلے بھی اس طرح کی اپیل کرچکی ہے۔ ابھی گذشتہ تین مہینہ پہلے اس نے بڑودہ میں ایسی ہی دھمکی آمیز اپیل کی تھی لیکن اسے خود ہندوؤں نے قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ اس سے پہلے فرقہ وارانہ فساد کے فوراً بعد بھی اس نے ایسی ہی کارروائی کی تھی جس کی وجہ سے کئی مہینہ تک متعدد علاقوں میں مسلمانوں کا بائیکاٹ کیا گیا تھا اور گاؤں میں ان کے داخلہ پر پابندی لگادی گئی تھی۔

اس حقیقت کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے کہ گجرات میں اب جو لوگ فسادات کے سلسلہ میں گرفتار کیے جارہے ہیں وہ مسلمانوں کی شکایت پر نہیں بلکہ سپریم کورٹ کی ہدایت پر گرفتار کیے جارہے ہیں۔ اس طرح یہ کہنا درست ہوگا کہ قانون خود اپنا کام کررہا ہے۔ مسلمانوں نے تو صرف اپنے اوپر ہونے والے مظالم کی آدھی ادھوری ایف آئی آر درج کرائی تھی جنھیں ریاستی حکومت نے ردّی کی ٹوکری میں ڈلوادیا تھا اور یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اس نے قاتلوں کو تحفظ فراہم کردیا ہے۔

یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ایک طرف تو شرپسند عناصر مسلمانوں کو بائیکاٹ کی دھمکی دے رہے ہیں اور دوسری طرف آزادی جمہوریت اور مساوات کی دعویدار مودی حکومت خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مودی حکومت ان شرپسندوں کے منہ پر لگام لگانے کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی ہی کرے گی اس لیے کہ ان مقدمات کی فائلوں کا دوبارہ کھلنا خود مودی کے منہ پر سپریم کورٹ کا زوردار طمانچہ ہے جو اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا ہے۔

(باقی صـ۱۴ـ پر)

ریاستہائے متحدہ امریکہ کا نظام حکومت (۹)

انتظامیہ (Executive): دستور کی رو سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی انتظامیہ (Executive) کا حاکم اعلیٰ صدر ہے۔ اس فردِ واحد کو بے شمار اور وسیع انتظامی اختیارات حاصل ہیں۔ اختیارات کے اعتبار سے اسے دُنیا کا سب سے بڑا با اختیار حاکم کہا جاتا ہے۔ برعکس اس کے دوسرے جمہوری ملکوں مثلاً جمہوریۂ ہند اور فرانس کے صدر کے اختیارات محدود ہیں۔ اس لیے کہ ان ملکوں کا طرزِ حکومت پارلیمنٹری جمہوری ہے اور انتظامیہ اپنے سارے کاموں اور پالیسیوں کے لیے منتخبہ مجالس قانون ساز (Legislature) کے سامنے جواب دہ اور ذمہ دار ہے۔ برعکس اس کے ریاستہائے متحدہ امریکہ کا صدر انتظامیہ کا حاکم اعلیٰ ہے۔ وہ اپنی کابینہ خود بناتا ہے اور اس کی حیثیت تمام تر صلاح کاروں یا مشیروں کی کونسل کی ہے۔ چونکہ دستور نے اسے واضح اور وسیع اختیارات عطا کیے ہیں اور عملاً اس کا انتخاب براہِ راست جمہور یا عوام کرتے ہیں اس لیے اس کو ان کی زیادہ حمایت حاصل رہتی ہے اور پھر چونکہ دستوری لحاظ سے وہ مقنّنہ (Legislature) یعنی کانگریس کے روبرو اپنی پالیسی کے لیے ذمہ دار اور جواب دہ نہیں اس لیے اسے اتنے زیادہ وسیع اختیارات حاصل ہیں۔

عالمِ اسلام

خانۂ کعبہ میں اصلاح و مرمت کا کام مکمل

سعودی حکومت نے سالانہ پروگرام کے مطابق خانہ کعبہ میں اصلاح و مرمت کا کام مکمل کر لیا ہے، اس کا آغاز ۷/اگست کو کیا گیا تھا۔ سرکاری خبر رساں ایس پی اے کے مطابق یہ کام وزارت خزانہ اور مقدس مساجد کی انتظامیہ کے درمیان تعاون کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔ وزیر خزانہ محمد الجدعان نے بتایا کہ خادم حرمین شریفین شاہ سلمان کی ہدایت پر اصلاح و مرمت کا کام انجام دیا گیا جبکہ ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان اس کی براہ راست نگرانی کرتے رہے۔ وزیر خزانہ نے کہا کہ تمام سرکاری اداروں نے مقررہ وقت پر کام مکمل کرانے میں بھرپور تعاون کیا، اس پر وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔ وزیر خزانہ نے اپنی وزارت کے اعلیٰ عہدیداروں کے ہمراہ مسجد الحرام کا دورہ کرکے خانہ کعبہ کے حوالے سے مکمل کیے جانے والے امور کا معائنہ کیا۔ انہیں اس موقع پر خصوصی ٹیم کے ارکان نے مقررہ سکیم کے مطابق اصلاح و مرمت کے کام کے حوالے سے بریفنگ دی ہے۔

سوڈان عمر البشیر اور دیگر کو عالمی عدالت کے حوالے کرے گا

سوڈان نے دارفور تنازع کے مطلوبین کو انٹرنیشنل کریمنل کورٹ (آئی سی سی) کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ سابق صدر عمر البشیر، سابق وزیر دفاع عبدالرحیم محمد حسین اور شمالی کردفان کے سابق گورنر احمد ہارون انٹرنیشنل کریمنل کورٹ کو مطلوب ہیں۔ عرب نیوز کے مطابق سوڈان کی وزیر خارجہ مریم المہدی نے کہا ہے کہ سوڈان دارفور تنازع میں طویل عرصے سے مطلوب سابق آمر عمر البشیر اور دیگر کو انٹرنیشنل کریمنل کورٹ کے حوالے کرے گا۔ انہوں نے کہا کہ کابینہ نے مطلوب افراد کو انٹرنیشنل کریمنل کورٹ کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ۷۷ سالہ عمر البشیر ۲۰۰۹ء سے انٹرنیشنل کریمنل کورٹ کو مطلوب ہیں اور عدالت نے وارنٹ جاری کر رکھے ہیں۔ عمر البشیر کو حوالے کرنے کا فیصلہ آئی سی سی کے چیف پراسیکیوٹر کے دورہ سوڈان کے دوران ہوا ہے۔ العربیہ نیٹ کے مطابق انٹرنیشنل کریمنل کورٹ کے پراسیکیوٹر نے سوڈانی عہدیداروں سے کہا ہے کہ وہ دارفور تنازع کے مطلوبین کو جلد از جلد حوالے کرے۔

موجودہ صورتِ حال میں افواج کو فعال بنانا پہلی ترجیح ہے: اشرف غنی

افغانستان کے صدر اشرف غنی نے کہا ہے کہ ملک میں جاری حالیہ جنگ کے دوران افواج کو فعال کرنا ان کی سب سے بڑی ترجیح ہے اور اس کے لیے سنجیدہ اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ خبر رساں ادارے اے ایف پی کے مطابق قوم کو قوم کے نام ایک مختصر ویڈیو پیغام میں ان کا کہنا تھا کہ ملک کو خطرات کا سامنا ہے اور ان کو ملکی حالات کے بارے میں علم ہے۔ افغان صدر نے کہا کہ میں نے ملک میں سیاسی رہنماؤں اور ملک سے باہر شخصیات سے موجودہ صورتحال کے بارے میں مشورے شروع کیے ہیں اور بہت جلد نتائج کے بارے میں اپنے عوام کو آگاہ کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ سکیورٹی فورسز اور شہدا کے خاندانوں کو تسلی دینا چاہتا ہوں۔ اشرف غنی نے کہا کہ ایک تاریخی مشن میں وہ عوام پر مسلط کی گئی جنگ میں مزید اموات نہیں ہونے دیں گے۔ اس لیے میں نے حکومت کے اندر اکابرین، سیاسی رہنماؤں، عوامی نمائندوں اور بین الاقوامی شراکت داروں سے مشاورت شروع کی ہے تاکہ سیاسی حل کے ذریعے افغانستان کے شہریوں کے لیے امن اور استحکام فراہم کیا جاسکے۔

جمعیۃ علماء ہند اور ہندستان چھوڑو تحریک

جس نے ملک کی آزادی میں ایک نیا جوش وولولہ بھر دیا تھا

تحریر: مولانا محمد یٰسین جہازی

دوسری عالمی جنگ میں جرمنی کے خلاف انگریزوں نے بھارت کو زبردستی جنگ میں شامل کر دیا تھا، جس سے پورا بھارت انگریزوں کے خلاف مشتعل ہوگیا۔ ادھر دوسری طرف جاپان جرمنی کا ساتھ دیتے ہوئے جنگ میں کود پڑا، اور پے درپے حملے کرکے، ہندستان میں انگریزوں کی حکومت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ علاوہ ازیں مکمل آزادی کے نعرے کے ساتھ سول نافرمانی کی تحریک نے حالات کو دھماکہ خیز بنادیا۔ ان حالات کے پیش نظر حکومت برطانیہ نے ۱/مارچ ۱۹۴۲ء میں اسٹفرڈ کرپس کو، ہندستان کے تمام اہم سیاسی پارٹیوں کے لیڈران اور والیان ریاست کے نمائندوں سے گفتگو کرنے کے لیے ہندستان بھیجا۔ کرپس نے ۲۹/مارچ ۱۹۴۲ء کو اپنی تجویز پیش کردی۔ چونکہ اس میں ہندستان کی مکمل آزادی کا تذکرہ نہیں تھا، اس لیے کانگریس نے اس کو کلیتاً مسترد کردیا اور فوری طور پر ملک میں خودمختار حکومت تشکیل دینے کا مطالبہ کیا۔ مسلم لیگ نے بھی کرپس مشن کو یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کیا کہ اس میں مسلمانوں کے لیے ایک علاحدہ مملکت کے قیام کے لیے کوئی ٹھوس ضمانت نہیں دی گئی ہے۔ جمعیۃ چوں کہ انگریزوں کی عیارانہ فطرت سے بہ خوبی واقف تھی، اس لیے کرپس کی تجویز پیش کرنے سے پہلے ہی ۲۰-۲۱-۲۲/مارچ ۱۹۴۲ء کو اپنے تیرھویں اجلاس عام ایک ایسی تجویز پاس کی، جس میں اس مشن کو قبول کرنے کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔

جب کرپس مشن ناکام ہوگیا، تو چرچل نے ۱۲/اپریل ۱۹۴۲ء کو اسے لندن واپس بلالیا اور وائسرائے ہند لن لتھگو کو حکم دیا کہ وہ بھارتیوں کی تحریک آزادی کو ظلم وتشدد سے کچل ڈالے۔ چنانچہ لن لتھگو نے ہندستانیوں پر ظلم وستم کا پہاڑ توڑنا شروع کردیا اور داروگیر کی رفتار بڑھادی۔ جس سے عاجز آکر گاندھی جی نے کرو یا مرو کا نعرہ دیا اور ۱۴/جولائی ۱۹۴۲ء کو کانگریس کی مجلس عاملہ نے 'ہندستان چھوڑ دو' تحریک کی تجویز پاس کی۔ ۷/اگست ۱۹۴۲ء کو اپنے عاملہ کے اجلاس میں اس قرارداد کی تصدیق کرتے ہوئے ۸/اگست ۱۹۴۲ء کو عملی طور پر تحریک کا آغاز کردیا۔ اس تحریک سے پورے ہندستان میں بھونچال سا آ گیا۔ انگریزوں نے کانگریس اور جمعیۃ علماء ہند کے رہ نماؤں کو گرفتار کرنا شروع کردیا۔ حتیٰ کہ کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزادؒ، گاندھی جی اور دیگر بڑے رہ نماؤں کو ۹/اگست ۱۹۴۲ء کو ہی گرفتار کرلیا گیا جس سے حالات مزید دھماکہ خیز ہوگئے۔ "۱۱/اگست ۱۹۴۲ء: کانگریسی رہنماؤں کی گرفتاری پر پورے ملک میں اشتعال پھیل گیا۔ چوں کہ اس کا رہ نما کوئی نہیں تھا، تو مشتعل ہجوم نے جہاں جو کچھ ہوسکا، کرڈالا۔

بہار، سی پی اور مدراس تحریک میں سب سے آگے رہے۔ ریلوں کی پٹریاں اکھاڑ دی گئیں، تار کاٹ دیے گئے۔ سرکاری عمارتوں کو نقصان پہنچایا۔ جگہ جگہ پنچایتی حکومتیں قائم کرلی گئیں اور گورنمنٹ کے ملازمین کو خدمات سے سبک دوش کردیا گیا۔ بعض بعض موقعوں پر پولیس کو بھی کافی نقصان پہنچا۔ ۱۱/اگست کو دہلی میں تار کاٹ دیے گئے۔ پیلی کوٹھی- جس میں ریلوے کا پچاس سالہ ریکارڈ تھا- جلا کر خاکستر کردیا گیا۔ ٹاؤن ہال کو بھی آگ لگانے کی کوشش کی گئی، مگر کامیابی نہ ہوئی۔" (شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری، جلد سوم، ص ۲۸۸)

جمعیۃ کے اہم رہ نماؤں کی گرفتاری

جمعیۃ علماء ہند کے رہ نما اس تحریک کے آغاز سے پہلے سے ہی انگریزوں کے راڈار پر تھے۔ اس کے باوجود ۱۷-۱۸/اگست ۱۹۴۲ء کو جمعیۃ نے مجلس عاملہ کا اجلاس کرکے یہ اعلان کیا کہ انگریزوں کو دیس نکالا دینے کے لیے کانگریس کی اس تحریک "کوئیٹ انڈیا" میں شرکت کرنا مسلمانوں کا قومی و وطنی فریضہ ہے۔ اس تجویز میں کہا گیا کہ "ہندستان کے محبان آزادیِ وطن نے گورنمنٹ برطانیہ کے سامنے انتہائی مصالحانہ طریق پر اپنے حق وانصاف پر مبنی مطالبہ کو پیش کیا اور آخر وقت تک کوئی ایسی بات نہیں کی، جو حکومت کو اس مصیبت کے دور میں پریشان کرنے والی ہو۔ برطانیہ کی کامیابی اور ہندستانی دفاع کا مدار ہندستان کی کامل آزادی پر موقوف تھا۔ اور حکومت برطانیہ کی دانش مندی اسی میں تھی کہ وہ ہندستان کی آزادی کا اعلان کرکے ہندستان کو بھی ہلاکت سے بچنے کا موقعہ دیتی اور خود بھی مجبوریوں کی دستبرد سے عہدہ برآ ہونے کا ایک مستحکم طریقہ بہم پہنچاتی۔ مگر افسوس کہ حکومت برطانیہ نے اس کی ذرّہ برابر پرواہ نہیں کی اور اس کا نشہ استعمار اُترنا تو درکنار؛ ہلکا بھی نہ ہوا۔ بالآخر فدائیان حریت نے بالکل اضطرار اور مجبوری کے عالم میں اپنی منزل مقصود کا راستہ معین کیا جو عام سول نافرمانی کی تحریک عدم تشدد پر مبنی تھا۔

ظاہر ہے کہ ہندستان کے حقیقت شناس مدبروں اور صاحب بصیرت لیڈروں کے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا چارۂ کار بھی نہ تھا۔ اس پر بھی برطانوی حکومت کی آنکھیں نہ کھلیں اور وہ اپنی ضد سے باز نہیں آئی اور نہ صرف یہ کہ، اس نے حق و انصاف پر مبنی ہندستانی مطالبہ کو منظور نہیں کیا؛ بلکہ مزید براں نتائج وعواقب سے بے نیاز ہوکر انتہائی استبداد کے ساتھ عاجلانہ اقدام کرکے فدائیانِ آزادی کو گرفتار کرلیا۔ گورنمنٹ کی اس ناعاقبت اندیشانہ حرکت پر- جو لازمی نتیجہ ظاہر ہونا تھا- وہ ہوا۔ اور ہندستان کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک آگ لگ گئی۔ ہندستانیوں کے قلوب نفرت وعداوت سے لبریز ہوگئے اور عوام کے جذبات قابو سے باہر ہوگئے۔ اس سلسلہ میں جو واقعات رونما ہوئے، ان میں آگ لگانا، تار کاٹنا، عمارتوں اور دفتروں کو نقصان پہنچانا وغیرہ ایسے واقعات ہیں، جن کو کوئی سمجھ دار اور محبّ وطن انسان پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ ان واقعات پر جس قدر افسوس کیا جائے، بجا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ یہ سب کانگریس کے نام پر کیا جارہا ہے۔ حالاں کہ کانگریس کے مستحکم اصول "عدم تشدد" کے قطعی خلاف ہے۔ مگر اس کی تمام تر ذمہ داری حکومت کے عاجلانہ اقدام پر ہے کہ اس نے مقتدر اور ذی اثر رہنماؤں کو گرفتار کرکے عوام کو ان کی رہ نمائی سے محروم کردیا۔

کانگریس کی تحریک پرامن اور غیر متشددانہ سول نافرمانی کی ہے، جو انتہائی مجبوری اور اضطرار کی حالت میں بطور واحد علاج اور آخری طریقۂ کار کے اختیار کی گئی ہے۔ اور کوئی ہندستانی جس کو آزادی سے محبت ہو اور ہندستان کا خیرخواہ ہو اور وطن کی حفاظت کا مقصد اس کے پیش نظر ہو اور غیرملکی جابر حملہ آوروں کے خلاف کامیاب مدافعت کی تمنا رکھتا ہو؛ اس تجویز سے اختلاف نہیں کرسکتا۔

اس موقع پر ہم واضح کردینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر جمعیۃ علما کو اس امر کا ذرّہ بھر بھی وہم ہوتا کہ جدوجہد آزادی کا نتیجہ ہندستان میں ہندو راج قائم ہوجانا ہے، تو وہ ایک لمحہ توقف کیے بغیر اس کی شدید مخالفت کرتی۔ ہم آزاد ہندستان سے وہ آزاد ہندستان مراد لیتے ہیں، جس میں مسلمانوں کا مذہب، ان کی اسلامی تہذیب اور قومی خصوصیات آزاد ہوں اور مسلمانوں نے حصول آزادی کے لیے بھی قربانیاں پیش کی ہوں اور اپنی ذاتی قوت سے آئندہ بھی اس کی حفاظت کرسکیں۔

مسلمان جو انگریز کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے بیش بہا اور شان دار قربانیاں پیش کریں گے، ان کی نسبت ہندو کی غلامی قبول کرنے کا تصور بھی ان کی سخت ترین توہین ہے۔ مسلمان قوم کی سخت بدقسمتی ہوگی، اگر وہ توہمات اور خطرات میں مبتلا رہے اور موقعہ کی اہمیت اور نزاکت سے فائدہ اٹھانے کی بجائے، اپنی غفلت سے اسے ضائع کرے۔" (جمعیۃ علما کیا ہے، جلد دوم، ص ۲۳۹)

اس تجویز کی بار بار اشاعت کرکے ملک کے گوشے گوشے میں پھیلاتی رہی۔ انگریز جمعیۃ کے اس اقدام کو برداشت نہ کرسکے اور اس کے رہ نماؤں کی گرفتاری تیز کردی۔ صدر جمعیۃ علماء ہند شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کو اس تحریک کے آغاز سے پہلے ہی، ۲۵/جون ۱۹۴۲ء کو گرفتار کرکے مرادآباد جیل میں قید کردیا تھا۔ دیگر اکابرین جمعیۃ کو بھی یکے بعد دیگرے گرفتار کرتے رہے۔

حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ کی گرفتاری

> **"گاندھی جی نے گرفتاری کے بعد وائسرائے سے خط و کتابت شروع کی، جو فروری ۱۹۴۳ء تک جاری رہی۔ مگر وائسرائے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بالآخر گاندھی جی نے اکیس روز کا برت رکھا جو ۱۰/فروری ۱۹۴۳ء سے شروع ہوکر ۳/مارچ ۱۹۴۳ء کو ختم ہوا۔ دھلی میں اس موقع پر ایک صلح کانفرنس کا انتظام کیا گیا، جس میں گاندھی جی کے اس برت پر احتجاج بھی کیا گیا۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ چونکہ اس کی قیادت فرما رہے تھے، لٰہذا مولانا موصوف کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔"**

بسیار تلاش کے باوجود آپ کی تاریخ گرفتاری نہیں مل سکی تاہم یہ یقینی ہے کہ آپ کو ۳/مارچ ۱۹۴۳ء کے بعد کسی تاریخ میں گرفتار کیا گیا تھا۔ "گاندھی جی نے گرفتاری کے بعد وائسرائے سے خط وکتابت شروع کی، جو فروری ۱۹۴۳ء تک جاری رہی۔ مگر وائسرائے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بالآخر گاندھی جی نے اکیس روز کا برت رکھا جو ۱۰/فروری ۱۹۴۳ء سے شروع ہوکر ۳/مارچ ۱۹۴۳ء کو ختم ہوا۔ دہلی میں اس موقع پر ایک صلح کانفرنس کا انتظام کیا گیا، جس میں گاندھی جی کے اس برت پر احتجاج بھی کیا گیا۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ چوں کہ اس کی قیادت فرمارہے تھے، لہذا مولانا موصوف کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔" (علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، جلد، دوم، ص ۱۶۲)

اور ۲۴/**اپریل ۱۹۴۳ء کو دھلی جیل سے آپ کو رہا کیا گیا۔**

"دہلی ۲۴/اپریل۔ مولانا احمد سعید صاحب نائب صدر جمعیۃ علماء ہند اور مولانا عبدالماجد آج صبح دہلی ڈسٹرکٹ جیل سے دو ماہ کی نظر بندی کے بعد رہا کردیے گئے۔" (مدینہ بجنور، یکم مئی ۱۹۴۳ء)

حضرت مولانا حفظ الرحمان صاحبؒ کی گرفتاری

"ہندستان چھوڑ دو" تحریک میں ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند حضرت مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ کو بھی پابند سلاسل کردیا گیا۔ مولانا کی گرفتاری کے حوالے سے مولانا اسیر ادرویؒ صاحب لکھتے ہیں کہ: "جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ مولانا حفظ الرحمان صاحب سیوہارویؒ آئی، سی، سی کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے، اس لیے ان کو بھی اس اجلاس (مجلس عاملہ کانگریس، منعقدہ ۸/اگست ۱۹۴۲ء ممبئی) میں شریک ہونا تھا۔ آپ نے سیوہارہ سے بمبئی تک کا سفر تمام خطرات کے باوجود کیا۔ (پروگرام میں کوئیٹ انڈیا کی تجویز پاس ہونے کے بعد) تمام بڑے لیڈر گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزادؒ، جواہر لال نہرو، سردار پٹیل وغیرہ اسی شب گرفتار کرلیے گئے۔ اس افراتفری میں مولانا حفظ الرحمانؒ نے اپنی وضع بدل لی اور خفیہ طور پر بمبئی سے نکل گئے؛ مگر بھوپال کے بعد یوپی کی حدود شروع ہوجاتی ہیں۔ گرفتاری لازمی تھی؛ مگر مولانا موصوف بچتے بچاتے سیوہارہ پہنچ گئے اور دو اسٹیشن پہلے ہی ٹرین چھوڑ دی اور دوسرے ذرائع سے خفیہ سیوہارہ میں داخل ہوئے؛ کیوں کہ صوبائی پولیس آپ کی تلاش میں تھی۔ پھر آپ کو دہلی پہنچنا بھی ضروری تھا، اس لیے آپ نے دیہاتیوں کا لباس اختیار کیا اور کسی دور کے اسٹیشن سے دہلی کے لیے روانہ ہوگئے۔ دہلی میں آپ کی گرفتاری نہیں ہوسکتی تھی، کیوں کہ آپ کا وارنٹ یوپی گورنمنٹ نے جاری کیا تھا، جب تک وارنٹ یوپی سے منتقل ہوکر دہلی پہنچے، تب تک آپ محفوظ تھے۔ آپ نے فرصت سے فائدہ اٹھایا اور دہلی پہنچتے ہی جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کیا۔ ۱۷-۱۸/اگست ۱۹۴۲ء کو یہ اجلاس ہوا۔" (تاریخ جمعیۃ علماء ہند، جلد اول، ص ۱۱۷)

"مجاہد ملّتؒ کا وارنٹ گرفتاری یوپی سے منتقل ہوکر دہلی پہنچا اور مجاہد ملت کو ندوۃ المصنّفین قرول باغ دہلی سے گرفتار کرلیا گیا، جہاں آپ روزانہ اس کے منتظر رہا کرتے تھے۔

حسن اتفاق، آپ ضلع مرادآباد کی طرف سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے۔ لہٰذا آپ کا وارنٹ بھی مرادآباد سے آیا اور گرفتار کرکے آپ کو مرادآباد پہنچا دیا گیا، جہاں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ، عالی جناب حافظ محمد ابراہیم صاحب، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب، مولانا قاری عبد اللہ صاحب مرحوم اور دوسرے چند خصوصی رفقا پہلے سے موجود تھے۔" (الجمعیۃ، مجاہد ملت نمبر، ص ۱۰۳۔ ۲۶/فروری ۱۹۶۳ء)

بسیار تلاش کے باوجود گرفتاری کی تاریخ نہیں مل سکی۔ قرین قیاس یہ ہے کہ آواخر اگست یا آوائل ستمبر ۱۹۴۲ء میں آپ کی گرفتاری عمل میں آئی۔ اور دو سال کے بعد ۱۴/جولائی ۱۹۴۴ء کو سنٹرل جیل بریلی سے رہا ہوئے۔

"ایک حسن اتفاق نے اس اجلاس میں مسرت کی لہر پیدا کردی، یعنی حضرت مولانا حفظ الرحمان صاحبؒ تقریباً دو سال کی طویل نظر بندی کے بعد ۱۴/جولائی (۱۹۴۴ء) کو سنٹرل جیل بریلی سے رہا ہوکر ۲۶/رجب ۱۳۶۳ھ، مطابق ۱۸/جولائی ۱۹۴۴ء کو دہلی تشریف لائے اور اجلاس میں شرکت فرمائی۔" (جمعیۃ علما کیا ہے، جلد دوم، ص ۲۴۵)

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رکن عاملہ جمعیۃ علماء ہند کی گرفتاری

چونکہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمہ رکن عاملہ جمعیۃ علماء ہند، آل انڈیا کانگریس کے صدر تھے، اس لیے ۷/اگست ۱۹۴۲ء کو ممبئ میں منعقد آل انڈیا کانگریس کی مجلس عاملہ کا تاریخی اجلاس آپ کی صدارت میں ہوا، جس میں 'بھارت چھوڑ دو' کی انقلاب آفریں تجویز پاس کی گئی۔ اس تجویز کے پاس ہوتے ہی پورے ملک میں بجلی کی سی ایک لہر دوڑ گئی اور انگریزوں نے دیگر کانگریسی اور جمعیۃ علما کے رہ نماؤں کے

(بقیہ ص ۹ پر)

جمعیۃ علماء ہند اور ہندستان چھوڑو تحریک

جس نے ملک کی آزادی میں ایک نیا جوش وولولہ بھر دیا تھا

ساتھ آپ کو بھی ۹ راگست ۱۹۴۲ء کو گرفتار کرلیا گیا۔

''مولانا آزادؒ کی گرفتاری ۹ راگست ۱۹۴۲ء کی شب کو عمل میں آئی تھی۔ غبار خاطر میں مولانا نے گرفتاری کا قطعی وقت لکھا دیا ہے کہ اس وقت پانچ بج کر ۴۵ منٹ ہوئے تھے۔ ساڑے سات بجے ٹرین بمبئی سے روانہ ہوئی تھی اور اسی روز سوا دو بجے انھیں احمد نگر قلعہ میں لے جا کر قید کردیا گیا۔ ۱۰ راگست کے مکتوب میں مولانا نے اس گرفتاری کا قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔'' (شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری، جلد سوم، ص ۲۸۴)

مولانا کی رہائی

'بھارت چھوڑ دو' تحریک جوں جوں طویل ہوتی جارہی تھی، انگریزوں کی گرفت کمزور ہوتی جارہی تھی اور قید و بند دروازے کھلتے جارہے تھے، لیکن بڑے قائدین کو رہا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، اس لیے جمعیۃ علماء ہند نے ان قائدین کے حق میں آواز اٹھاتے ہوئے، ۸و۹ رنومبر ۱۹۴۴ء کو منعقد عاملہ کے اجلاس میں ایک تجویز پاس کی۔ بعد ازاں ۴-۵-۶ رمئی ۱۹۴۵ء کو منعقد اپنے چودھویں اجلاس عام میں اعلان کیا کہ جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس حضرت مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کی فوری رہائی کا گورنمنٹ سے مطالبہ کرتا ہے اور اپنے اس یقین کا اظہار کرتا ہے کہ مولانا کو بے وجہ گرفتاری کی وجہ سے جو اذیت اور جسمانی کوفت پہنچ رہی ہے، وہ اُن کے وقار اور ان کے تحفظ کے سخت خلاف ہے۔ اسی طرح حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی، مولانا نورالدین بہاری اور مسٹر آصف علی اور مسٹر رفیع احمد صاحب قدوائی کو تحفظِ صحت کے لیے فوراً رہا کردے۔ محرک: حضرت مولانا داؤد صاحب غزنوی۔ مؤید: ڈاکٹر ثناء اللہ صاحب۔'' (جمعیۃ علماء ہند، دستاویزات اجلاسہائے عام، جلد دوم، ص ۸۱۹)

چنانچہ ان کوششوں کی وجہ سے آپ کی رہائی ۱۵ رجون ۱۹۴۵ء میں عمل میں آئی: ''۱۵ رجون ۱۹۴۵ء: مارچ ۱۹۴۵ء میں وائسرائے ہند لارڈ ویول ہندستان کے جمود کو حل کرنے کے لیے لندن تشریف لے گئے اور شروع جون ۱۹۴۵ء میں ہندستان کے لیے نئی پیش کش لے کر واپس ہوئے۔ ۱۵ رجون ۱۹۴ء کی صبح کو مولانا ابوالکلام صاحب آزادؒ، پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبر جیل خانوں سے رہا کردیے گئے۔'' (شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری، جلد سوم، ص ۵۹۷) آپ تقریبا دو سال دس مہینے اور سات دن اسیر فرنگ رہے۔

حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ کی گرفتاری

حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ نے اپنی گرفتاری کی روداد خود لکھی ہے، انھیں کی زبانی سنیے: ''مجلس عاملہ منعقدہ ۱۷-۱۸ راگست ۱۹۴۲ء نے انڈین نیشنل کانگریس کے اقدام کی حمایت کرتے ہوئے ایک تجویز منظور کی اور طے یہ کیا گیا کہ اس کو کثیر تعداد میں طبع کرا کر ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچایا جائے۔

خلاف قانون تجویز کا طبع کرانا، خود ایک خطرناک مرحلہ تھا اور اس کو پورے ملک میں تقسیم کرنا اور چپہ چپہ پر پہنچانا؛ اس سے کہیں زیادہ سخت مرحلہ تھا۔ یہ خدمت مولانا عبد الماجد صاحب دہلوی مرحوم اور احقر کے سپرد ہوئی۔ دہلی سے مشرقی ہندستان کے آخری کنارہ تک تقسیم کرنا اور پہنچانا احقر کے ذمہ کیا گیا اور پنجاب اور فرنٹیئر میں اس کو پھیلانا مولانا عبد الماجد صاحبؒ کے سپرد کیا گیا۔ جنوبی ہند کے لیے بھی دفتر نے کوئی انتظام کیا ہوگا، احقر کو اس کا علم نہیں ہوسکا۔ اس زمانہ میں احقر کا تعلق مدرسہ شاہی مراد آباد سے تھا، مستقل سکونت مراد آباد ہی میں رہا کرتی تھی۔ مگر 'بجرم عشق حریت' ۸ راگست کو رفقائے محترم حافظ محمد ابراہیم صاحب (موجودہ وزیر مرکزی حکومت)، مولانا قاری عبداللہ صاحب مرحوم، مولانا محمد اسمٰعیل سنبھلی ایم۔ ایل۔ اے کو مراد آباد سے گرفتار کیا گیا، تو احقر نے فوراً ہی روپوش ہوجانا ضروری سمجھا۔

چنانچہ پولیس گرفتاریوں میں مصروف تھی اور احقر تاریک اور غیر معروف گلیوں، کوچوں میں ہوتا ہوا مراد آباد سے نکل رہا تھا۔ میرے نسبتی بھائی حافظ سادات حسن صاحب ازراہ ہمدردی احقر کے ساتھ ہولیے۔ ہم دونوں ۸ رمیں پا پیادہ طے کرکے قصبہ حکیم پور پہنچے۔ جب چند گھنٹہ بعد دہلی جانے والی پسنجر حکیم پور پہنچی، تو احقر اس سے روانہ ہوا۔ لیکن ٹرین میں زیادہ دیر تک بیٹھنا بھی مناسب نہیں تھا۔ لہٰذا سمبھاولی اسٹیشن پر اُتر گیا اور موضع ویٹ میں -جو اسٹیشن سمبھاولی سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ اپنے ماموں زاد بھائی مولانا سیّد محمد اعلیٰ صاحب صدر مدرس مدرسہ اعزازیہ قصبہ ویٹ کے یہاں دو تین روز قیام کیا۔ پھر کچھ پا پیادہ اور کچھ بس سے سفر کرتے ہوئے دہلی پہنچنا چاہتا تھا کہ جمنا کے پل پر راستہ روک دیا گیا کہ شہر میں کانگریسیوں نے فساد برپا کر رکھا ہے۔

فساد کا تماشہ میں خود بھی جمنا پار سے دیکھ رہا تھا۔ کیوں کہ پیلی کوٹھی کو، جس میں ریلوے کا ریکارڈ تھا، آگ لگا دی گئی تھی اور اس کے شعلے آسمان سے باتیں کررہے تھے۔ یہ شعلے جمنا پار؛ بلکہ شاہد رہ سے نظر آرہے تھے۔ اس وقت جمنا برج سے واپس ہوکر غازی آباد پہنچا۔ پھر غازی آباد سے دہلی پہنچنے کی داستان طویل ہے۔ مختصر یہ کہ مجاہد ملت جیسے ہی دہلی پہنچے، احقر بھی کسی صورت سے دہلی پہنچ گیا۔ مجاہد ملتؒ 'ندوۃ المصنّفین' کے رفیق تھے۔ ندوۃ المصنّفین قرول باغ کی ایک کوٹھی میں تھا۔ مجاہد ملتؒ یہاں قیام فرمایا کرتے تھے۔ آپ اس وقت بھی وہیں فروکش ہوگئے۔ مگر احقر کا قیام دفتر ہی میں رہا۔ اور ۱۷-۱۸ راگست ۱۹۴۲ء کو مدعو خصوصی کی حیثیت سے مجلس عاملہ کے اجلاس میں شرکت کرنے کے بعد حسب ہدایت اراکین مجلس عاملہ' مجلس عاملہ کی تجویز اور اعلان کے بنڈل لے کر کلکتہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

جگہ جگہ ہڑتالیں ہورہی تھیں۔ پولیس اور فوج کی گولیاں موت کی بارش برسا رہی تھیں۔ ریل کی پٹریاں اکھاڑی جارہی تھیں۔ ٹیلیفون اور ٹیلی گراف کے تار کاٹ کر نظام حکومت خصوصاً ریلوے کے نظام کو معطل کیا جارہا تھا اور بارش کی مسلسل جھڑیوں نے جس طرح پولیس اور سی آئی ڈی کے کام کو دشوار کردیا تھا، مسافروں کے لیے بھی صعوبتیں پیدا کردی تھیں۔

بہر حال ان حالات کو انگیز کرتے ہوئے دہلی سے روانہ ہوکر مغلسرائے تک تو رسائی ہوگئی، لیکن مغل سرائے کے بعد سفر کی تمام صورتیں ناممکن ہوگئیں؛ کیونکہ ریلوے کی پٹریاں تو تحریک کی نذ رہوگئی تھیں اور عام راستوں اور سڑکوں کو سیلاب نے ناقابل عبور بنا دیا تھا۔ مجبوراً احقر جونپور واپس ہوا اور محترم حاجی ولی محمد صاحب مرحوم کے ایک مکان میں گوشہ نشین ہوکر اس لٹریچر کو مختلف صورتوں سے ہندستان کے گوشے گوشے میں پہنچانے کا انتظام کیا۔ اس مرتبہ تحریک کے پروگرام میں یہ بات بھی داخل تھی کہ جہاں تک ممکن ہو گرفتاری سے بچ کر باہر کام کیا جائے۔ احقر اس سفر سے واپس ہوکر مراد آباد پہنچا۔ اور بظاہر اپنے آپ کو کامیاب سمجھتا تھا کہ گرفتار نہیں ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ احقر اس زمانہ میں گرفتار شدہ احباب اور بزرگوں کی جانب سے موقع بموقع سرکلر جاری کرتا رہتا تھا۔ ایک سرکلر جو سراسر باغیانہ تھا، اس کو پشاور میں کالج کے طلبہ نے پشتو میں ترجمہ کرکے شائع کیا اور اس پر احقر کا نام بھی لکھ دیا۔ فرنٹیئر کی پولیس نے وہ سرکلر یوپی بھیجا، تو اب بقول انسپکٹر پولیس، یوپی کی پولیس کے لیے چشم پوشی ناممکن ہوگئی۔

بہر حال اکتوبر ۱۹۴۲ء میں احقر بھی گرفتار ہوا۔ احقر خوش تھا کہ رات دن کی دوڑ دھوپ سے نجات ملی۔ جیل خانہ میں کچھ آرام کا موقع ملے گا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ حضرت شیخ الاسلام جیسے مرشد و مربی اور حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ جیسے رفیق مخلص کی معیت میسر آئے گی۔'' (الجمعیۃ، مجاہد ملت نمبر، ص ۱۰۱ تا ۱۰۴۔ ۲۶ رفروری ۱۹۶۳ء)

حضرت مولانا محمد میاں صاحب کی دوبارہ گرفتاری

اکتوبر ۱۹۴۲ء میں گرفتار ہونے کے بعد کب رہا ہوئے، اس کی تاریخ نہیں مل سکی؛ لیکن مولاناؒ کو دوبارہ ۲۶ ردسمبر ۱۹۴۲ء کو مراد آباد سے گرفتار کرلیا گیا۔ ''مراد آباد ۲۶ ردسمبر ۱۹۴۲ء۔ تقریبا دس بجے رات حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ ناظم جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ کو اچانک کوتوال شہر نے کوتوالی میں بلا کر دفعہ ۱۲۹ کے ماتحت گرفتار کرلیا۔ مولانا موصوف ایک عرصہ سے بہت ہی پرامن اور خاموش طریقے سے درس و دریس کے سلسلہ میں مشغول تھے۔ مراد آباد کی اس وقت کی پر امن فضا میں حکومت کا یہ اقدام یقیناً اس پرامن فضا میں بے چینی پیدا کردینے والا ہے۔ نائب ناظم جمعیۃ علماء شہر مراد آباد۔'' (مدینہ، بجنور ۵ رجنوری ۱۹۴۳ء)

مولاناؒ کی رہائی

حافظ سید سادات حسن کے نام لکھے حضرت شیخ الاسلامؒ کے مکتوب میں، مولانا محمد میاں صاحبؒ کی رہائی کی تاریخ ۸ رجون ۱۹۴۴ء تحریر ہے:

''حقیقت اخبار لکھنو اور پھر قاری صاحب دیوبند اور مولانا عبدالحق صاحب کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ مولانا محمد میاں صاحب ۸ رجون کو بلا شرط رہا ہوگئے۔'' (مکتوبات نمبر ۱۰۳، مکتوبات شیخ الاسلام، جلد چہارم، تاریخ مکتوب ۲۴ رجون ۱۹۴۴ء) بحوالہ شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری، جلد سوم، ص ۴۱۷)

دیگر قائدین کی گرفتاریاں

صدور اور نظمائے جمعیۃ کے علاوہ دیگر سیکڑوں قائدین ملت نظر بند کردیے گئے۔ ''پنجاب میں تحریک تمام ہندستان سے کمزور رہی۔ صوبہ سرحد میں حکومت نے انتہا سے زیادہ نرم پالیسی اختیار کی۔ ان کی قانون شکنی اور سول نافرمانی کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ مسلمانوں کے متعلق حکومت کی پالیسی یہی تھی کہ ان کی گرفتاری

خلاف قانون تجویز کا طبع کرانا، خود ایک خطرناک مرحلہ تھا اور اس کو پورے ملک میں تقسیم کرنا اور چپہ چپہ پر پہنچانا؛ اس سے کہیں زیادہ سخت مرحلہ تھا۔ یہ خدمت مولانا عبد الماجد صاحب دھلوی مرحوم اور احقر کے سپرد ہوئی۔ دھلی سے مشرقی ھندستان کے آخری کنارہ تک تقسیم کرنا اور پھنچانا احقر کے ذمہ کیا گیا اور پنجاب اور فرنٹیئر میں اس کو پھیلانا مولانا عبد الماجد صاحبؒ کے سپرد کیا گیا۔ جنوبی ھند کے لیے بھی دفتر نے کوئی انتظام کیا ھوگا۔

صفحہ ۸ کا بقیہ

میں زیادہ سے زیادہ پہلوتہی کی جائے؛ تاہم مولانا حفظ الرحمان صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند، مولانا احمد سعید صاحبؒ، مولانا نورالدین صاحب بہاریؒ مولانا عبدالماجد صاحبؒ، مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانویؒ، مولانا داود صاحب غزنویؒ، مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلیؒ، مولانا قاری عبداللہ صاحب مرحوم مرادآبادیؒ، مولانا عبد الوہاب صاحبؒ بستوی، مولانا محمد شاہد صاحبؒ فاخری الہ آباد، مولانا منیر الزماں صاحبؒ اسلام آبادی، مولانا عبد الباری صاحبؒ عباسی، مولانا منظور النبی صاحبؒ سہارنپوری جیسے سیکڑوں بزرگان ملت نظر بند کیے گئے۔ اور ان کے ساتھ عام مسلمانوں کی تعداد تو ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ صوبہ آسام کی جمعیۃ علما کی پیش قدمی یہاں تک بڑھی کہ آسام میں جمعیۃ علماء آسام کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔'' (علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، جلد دوم، ص ۱۶۱)

مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ نے علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے جلد دوم میں چند مزید اسیران فرنگ کے نام تحریر فرمائے ہیں: منشی معین الدین صاحب، رئیس، قصبہ سنبھل، ضلع مراد آباد، مولانا عبد القیوم صاحب سنبھلیؒ اور کامریڈ محمد ابراہیم صاحب مرادآبادی ممبر صوبہ کانگریس وغیرہ بھی رفقائے جیل کے زمرہ میں داخل ہوگئے۔ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مردآباد کے چند طلبائے عزیز اور کچھ دوسرے حضرات جو ضلع مراد آباد سے گرفتار کیے گئے تھے۔'' (ص ۱۹۵)

مدرسہ شاہی کے طلبہ اور دوسروں کے نام اسی جگہ حاشیہ میں درج کیے گئے ہیں۔

مولوی غلام حسین صاحب چمپانگر بھاگلپور، فاضل جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد۔ مولوی منصور علی صاحب چمپا نگر بھاگلپور، فاضل جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد۔ مولوی قربان علی صاحب بھاگلپوری فاضل جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد۔ مولوی عبد المنان صاحب کٹکی فاضل دارلعلوم دیوبند۔ مولوی عصمت علی صاحب سہلٹی، متعلم مدرسہ شاہی مراد آباد۔ مولوی سراج الدین صاحب بھاگلپوری، فاضل جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد۔ مولانا مقصود احمد صاحب ترکی سنبھلی فاضل مدرسہ امینیہ دہلی۔ حافظ علی حسین صاحب سنبھلی شیخ انعام اللہ صاحب مراد آبادی۔'' (علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، جلد دوم ۱۹۵-۱۹۶)

دھلی میں احتجاجی جلسے

''۱۷ راگست ۱۹۴۲ء کو دہلی میں دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کے سلسلے میں حریت پسندوں نے ایک زبردست جلوس نکالا۔ کوئٹ انڈیا کے نعروں کی گونج بھارت سے لندن تک برابر اثر انداز ہوتی رہی۔ وطن پرستوں کا یہ جلوس کوچہ چیلان میں بہت بڑے جلسے کی شکل اختیار کرگیا۔ اس جلسے میں کئی نمائندوں کی تقریریں ہوئیں۔ جناب مولانا احمد سعید صاحب کے صاحبزادے مولانا محمد سعید صاحب نے بڑی ولولہ انگیز تقریر کی۔ حکومت نے مولانا کو گرفتار کرلیا اور بھی دوسرے مقرر لیڈروں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ (حسرت موہانی، ایک سیاسی ڈائری، ص ۲۲۰۔ بحوالہ شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری، جلد سوم، ص ۲۸۹)

ھندستان چھوڑو تحریک اور مسلم لیگ

''ہندستان چھوڑو'' تحریک - جو ملک عزیز کی آزادی کا سبب بنا اور جس کی وجہ سے انگریزوں نے وسیع پیمانے پر دور گیر کا سلسلہ جاری کیا ہوا تھا- کو مسلم لیگ نے (باقی ص ۱۴ پر)

عالمی خبریں

کینیڈا کا خواتین رہنماؤں سمیت ۲۰ ہزار افغانوں کو پناہ دینے کا اعلان

کینیڈا نے کہا ہے کہ وہ بیس ہزار افغانوں کو اپنے ہاں لے جائے گا جن میں خواتین لیڈرز، سرکاری ملازمین اور وہ دوسرے افراد شامل ہوں گے جن کو طالبان کی جانب سے جان کا خطرہ ہے کیونکہ شدت پسند پورے ملک میں اہم شہروں پر قبضے کررہے ہیں۔ فرانسیسی خبر رساں ادارے اے ایف پی کے مطابق کینیڈا کے امیگریشن منسٹر مارکو مینڈیسینو نے پریس کانفرنس کرتے ہوئے کہا کہ افغانستان کی صورت حال دل دہلا دینے والی ہے، ایسے میں کینیڈا خاموش نہیں بیٹھے گا۔ میڈیسینو کا مزید کہنا تھا کہ پناہ گزینوں میں خصوصی طور پروہ کمزور لوگ شامل ہوں گے جو ابھی تک افغانستان میں ہیں یا پھر ہمسایہ ریاستوں کی طرف چلے گئے ہیں، جبکہ ان میں خواتین رہنما، سرکاری ملازمین، انسانی حقوق کے کارکن، اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد اور صحافی بھی شامل ہوں گے۔ کینیڈین امیگریشن منسٹر کے مطابق پناہ کے متلاشیوں کے کئی جہاز کینیڈا کے لیے روانہ ہوچکے ہیں جن میں سے پہلی پرواز ٹورانٹو میں لینڈ کررہی ہے۔ کینیڈا کی جانب سے کہا گیا ہے کہ وہ افغانستان کی صورت حال کو قریب سے مانیٹر کررہا ہے اور اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر کام بھی کررہا ہے۔

اگر میں صدر ہوتا تو افغانستان سے امریکہ کا انخلاق شرائط کے ساتھ ہوتا: ٹرمپ

سابق امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے افغانستان سے امریکی افواج کو کسی شرط کے بغیر نکالنے پر موجودہ صدر جو بائیڈن پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ طالبان کی کارروائیاں ناقابل قبول ہیں۔ فرانسیسی نیوز ایجنسی اے ایف پی کے مطابق ڈونلڈ ٹرمپ نے کہا کہ اگر وہ صدر ہوتے تو امریکی فوج کا انخلا بہت مختلف اور کامیاب ہوتا۔ خیال رہے کہ ۲۰۲۰ء میں دوحہ میں ٹرمپ کے دور حکومت کے دوران طالبان کے ساتھ معاہدہ ہوا تھا جس کے تحت مئی ۲۰۲۱ء میں افغانستان سے امریکی افواج کا انخلا طے پایا تھا اور اس کے لیے کئی ضمانتیں لی گئی تھیں۔ جب جو بائیڈن نے اقتدار سنبھالا تو انہوں نے انخلا کی تاریخ آگے کر دی اور کوئی شرط نہ رکھی۔ ڈونلڈ ٹرمپ نے ایک بیان میں دعویٰ کیا کہ اگر میں صدر ہوتا تو دنیا دیکھتی کہ افغانستان سے ہمارا انخلا شرائط کے ساتھ ہوتا۔ میں نے ذاتی طور پر طالبان قیادت سے بات کی تھی اور وہ اب جو کررہے ہیں وہ نہ کرتے تاہم انہوں نے واضح طور پر یہ نہیں بتایا کہ وہ طالبان کی کارروائیوں کو روکنے کے لیے کیا کرتے۔

پاکستانی سپریم کورٹ کی پہلی جج مقرر ہوں گی عائشہ ملک

پاکستان کی عدالتی تاریخ میں پہلی مرتبہ جوڈیشل کمیشن آف پاکستان (جے سی پی) ایک خاتون جج کو سپریم کورٹ میں ترقی دینے جارہا ہے۔ ڈان کی ایک رپورٹ کے مطابق جسٹس عائشہ اے ملک لاہور ہائی کورٹ کی سینیارٹی لسٹ میں چوتھے نمبر پر ہیں جنہیں اگر سپریم کورٹ میں ترقی دے دی گئی تو وہ مارچ ۲۰۳۱ء تک سپریم کورٹ کی جج رہیں گی۔ اس وقت سپریم کورٹ میں ۱۷ مقررہ ججوں کی تعداد پوری ہے اور جسٹس عائشہ ملک ۱۷ اگست کو جسٹس مشیر عالم کی ریٹائرمنٹ سے خالی ہونے والی اسامی پر کریں گی۔ ہندوستان کا حوالہ دیتے ہوئے وکیل نے کہا کہ جسٹس فاطمہ بی بی وہ پہلی خاتون جج تھیں جنہیں سپریم کورٹ آف انڈیا میں ترقی دی گئی جو ۱۹۹۲ء میں ریٹائر ہوگئی تھیں اور اب تک ۸ خواتین جج سپریم کورٹ کا حصہ بن چکی ہیں۔

آزاد ہندوستان میں نفرت انگیز مہم کا جواب محبت و اخلاق سے دیں

تحریر: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں اُنس اور محبت کا جذبہ ودیعت فرمایا ہے۔ وہ محبت کرتا بھی ہے اور محبت چاہتا بھی ہے۔ اگر تعصب اور عناد کا نشہ اس پر چڑھا ہوا نہ ہو تو فطرت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ محبت سے پیش آئے۔ اس میں خاندان، زبان، علاقہ اور مذہب رکاوٹ نہیں بنتا۔ اگر سڑک پر کوئی حادثہ پیش آجائے اور کوئی زخمی تڑپ رہا ہو تو ہر شخص مدد کے لیے اس کی طرف بڑھتا ہے، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، گورا ہو یا کالا، مرد ہو یا عورت اور کسی زبان کا بولنے والا یا کسی مقام کا رہنے والا ہو۔ اگر کسی گھر میں آگ لگ جائے تو ہر شخص آگ بجھانے کو دوڑتا ہے اور اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق اس میں شامل ہوتا ہے۔ یہ بات نہیں دیکھی جاتی کہ یہ مکان کس کا ہے اور اس کا تعلق کس گروہ سے ہے؟ یہی اصل انسانی فطرت ہے، اگر انسان اس جذبہ سے محروم ہوجائے تو پھر انسانی سماج اور اس جنگل کے درمیان کچھ فرق باقی نہیں رہے گا جس میں درندے رہتے ہیں۔

جیسے انسان خود محبت کرتا ہے، اسی طرح وہ اپنے لیے بھی محبت کا بھوکا ہوتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ ماں باپ، بال بچے، شوہر اور بیوی، خاندان کے لوگ یہاں تک کہ سماج کے تمام لوگ اسے محبت کی نظر سے دیکھیں، بعض دفعہ انسان کا دل پتھر کی طرح سخت ہوجاتا ہے، لیکن محبت کی آنچ اسے بھی موم بنادیتی ہے، طاقت اور زور زبردستی کے ذریعہ جو بات نہیں منوائی جاسکتی تھی، محبت کے دو بول اور خوش اخلاقی کے اظہار کے ذریعہ وہ بات منوالی جاتی ہے۔ انسان کی یہ فطرت اسی وقت معطل ہوتی ہے جب تعصب، تنگ نظری، غلط فہمی و بدگمانی اور پروپیگنڈہ انسان کے دل و دماغ کو نفرت کی آماجگاہ بنادیتا ہے، لیکن عام طور پر انسان کے اندر یہ کیفیت وقتی طور پر پیدا ہوتی ہے، جیسے صابن میل کچیل کو صاف کردیتا ہے، اسی طرح حسن اخلاق دل کے غبار کو دھو دیتا ہے۔

محبت اور حسن اخلاق تو ہر انسان کے ساتھ ضروری ہے لیکن اگر کوئی شخص یا گروہ آپ کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہے تو اس کے ساتھ بہتر رویہ اختیار کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ ہندوستان میں اس وقت برادرانِ وطن کی صورتِ حال یہی ہے۔ اس ملک میں صدیوں سے مختلف قومیں آباد رہی ہیں اور انھوں نے شیر و شکر ہوکر اس ملک کی خدمت کی ہے، مختلف مسلمان خاندانوں نے کم و بیش آٹھ سو سال اس ملک پر حکومت کی ہے، ان کی فوج اور رعایا میں ہندو، مسلمان اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود تھے۔ اگر وہ ایک دوسرے سے نفرت کرنے والے ہوتے تو کیسے اتنے وسیع ملک میں یہ حکومتیں قائم رہتیں اور امن وامان کا دور دورہ ہوتا، اس لیے سچائی یہی ہے کہ انگریزوں کے تسلط سے پہلے تک یہاں محبت اور بھائی چارہ کی عام فضا تھی، بدقسمتی سے بعض فرقہ پرست گروہوں کو یہ بات پسند نہیں ہے اس لیے انھوں نے اس ملک کے طول و عرض میں نفرت کا بیج بونا شروع کردیا ہے اور اب یہ زہریلا پودا دن بہ دن تناور ہوتا جارہا ہے۔ بیماری کا علاج عام طور پر اس کی ضد سے ہوتا ہے، گرمی کا اثر دور کرنے کے لیے ٹھنڈی چیز دی جاتی ہے اور ٹھنڈک سے بچاؤ کے لیے گرم چیز استعمال کی جاتی ہے، شوگر کے مریض کو کڑوی غذا دی جاتی ہے۔ اگر گرمی کے اثر سے بیمار ہونے والے شخص کو مزید گرم چیزیں اور ٹھنڈک کے مریض کو اور بھی ٹھنڈی چیزیں دی جائیں یا شوگر کے مریض کو اور بھی میٹھی چیزیں کھلائی جائیں تو ظاہر ہے کہ اس سے بیماری میں اضافہ تو ہوگا، بیماری دور نہیں ہوسکے گی۔ اسی طرح اگر نفرت کے ردّعمل میں نفرت ہی کا اظہار ہو تو ہر طرف نفرت ہی کے کانٹے اُگ آئیں گے، محبت کے پھول کہیں باقی نہیں رہیں گے اس لیے مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ اس نفرت انگیز مہم کا جواب محبت اور اخلاق کے ذریعہ دیں اور اس تدبیر کے ذریعہ ماحول کو بدلنے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں روزمرہ کی چند قابل توجہ اور ضروری باتیں یہ ہیں:

اکثر و بیشتر آپ کے مکان و دکان کے قریب غیر مسلم پڑوسی ہوتے ہیں، ان کے ساتھ بہتر سلوک کیجیے، اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر پڑوسیوں کے ساتھ بہتر سلوک کا حکم فرمایا ہے۔ (النساء:۳۶) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حضرت جبرئیل علیہ السلام مجھے پڑوسی کے بارے میں اس قدر تلقین کرتے ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہیں ان کو وارث نہ بنا دیا جائے۔ (بخاری، باب الوصاۃ بالجار، حدیث نمبر:۶۰۱۴، مسلم باب الوصیۃ بالجار والاحسان الیہ، حدیث نمبر:۲۶۲۳)

حدیث کے شارحین نے لکھا ہے کہ اس میں مسلمان، غیر مسلم، عبادت گزار، فاسق، اجنبی، ہم وطن، نقصان پہنچانے والا، فائدہ پہنچانے والا، رشتہ دار، غیر رشتہ دار، قریب کے گھر والے اور دور کے گھر والے سب شامل ہیں۔ (تحفۃ الاحوذی:۶/۶۲)

ایک حدیث میں ہے کہ پڑوسی تین طرح کے ہیں، ایک: ایسا غیر مسلم پڑوسی جس سے رشتہ داری نہ ہو، اس کا ایک حق ہے، دوسرے: مسلمان پڑوسی، اس کے دو حقوق ہیں، تیسرے: مسلمان رشتہ دار پڑوسی، اس کے تین حقوق ہیں۔ (شعب الایمان، اکرام الجار، حدیث نمبر:۹۱۱۳)

پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ آپ کی طرف سے مطمئن ہو، اس کو یہ اندیشہ نہ ہو کہ آپ کی ذات سے اس کو نقصان پہنچے گا، چنانچہ ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار ارشاد فرمایا: خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہوسکتا، صحابہؓ نے عرض کیا: کون اے اللہ کے رسول؟ آپ نے فرمایا: جس کا پڑوسی اس کے شر سے مامون نہ ہو۔ (بخاری، باب اثم من لایامن جارہ بوائقہ، حدیث نمبر ۶۰۱۶، مسلم باب بیان تحریک ایذاء الجار، حدیث نمبر ۱۷۰)

پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک میں یہ بھی شامل ہے کہ آپ کے یہاں کوئی اچھی چیز پکے اور غیر مسلم پڑوسی وہ کھاتا ہو تو اس کے گھر بھیج دیا کریں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ کے یہاں ایک بکری ذبح کی گئی تو خاص طور پر اس میں سے پڑوس میں رہنے والے یہودی کو تحفہ بھیجنے کا حکم دیا۔ (تحفۃ الاحوذی:۶/۶۲) اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ آپ کے کسی عمل سے آپ کے غیر مسلم پڑوسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے آپ کا ارشاد منقول ہے کہ جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو، وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچائے۔ (بخاری، حدیث نمبر:۶۰۱۸)

پڑوسی کی ایک خاص صورت وہ ہے جس کو قرآن مجید میں 'صاحب بالجنب' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے ایسے لوگ مراد ہیں جن سے تھوڑی دیر کا ساتھ ہو، جیسے سفر کا ساتھی، کلاس کا ساتھی، دفتر اور پیشے کا ساتھی وغیرہ۔ (مفاتیح الغیب: ۱۰/۷۷) ان کے ساتھ بھی خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے بہتر سلوک کا حکم فرمایا ہے۔ جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں قدم قدم پر غیر مسلم بھائیوں کا ساتھ ہوتا ہے، خاص کر جہاز میں، ٹرین میں، بس میں، ان مواقع پر ان کے ساتھ خوش اخلاقی کا ثبوت دیجیے، ان کا سامان اُٹھانے میں، سامان رکھنے میں یا سامان اُتارنے میں اگر آپ کی مدد کی ضرورت ہو تو خود سے بڑھ کر مدد کرنے کی کوشش کیجیے۔ اگر ان کے ساتھ کوئی مریض یا بوڑھا شخص ہو یا خاتون اور بچے ہوں اور آپ کی سیٹ ان کے لیے زیادہ موزوں ہوسکتی ہے تو ایثار سے کام لیجیے اور خود تھوڑی سی زحمت برداشت کرلیجیے، چائے یا کھانے پینے کی ہلکی پھلکی چیز منگائیے تو ان کو بھی شامل ہونے کی دعوت دیجیے، ہر قیمت پر جھگڑے تکرار سے بچیے، جو بڑے ہیں ان کو ان کی عمر کے لحاظ سے چچا، نانا، خالہ اور نانی وغیرہ کے لفظ سے، جو برابر عمر کے ہیں ان کو بھائی کے لفظ سے اور جو کافی چھوٹے ہیں ان کو ان کی عمر کے لحاظ سے مخاطب کیجیے، کسی بوڑھے آدمی کو آپ کے سہارے کی ضرورت ہو تو بڑھ کر سہارا دے دیجیے۔

آپ کا یہی سلوک ان دوستوں کے ساتھ ہونا چاہیے جو آپ کے آفسوں کے یا کلاس کے ساتھی ہیں، یہ تھوڑا سا حسن سلوک ان کے دل پر گہرا نقش چھوڑے گا اور مسلمانوں کے بارے میں ان کے ذہن میں ایک اچھی تصویر اُبھرے گی، اور یہ بات خاص طور پر ذہن میں رکھیں کہ اگر وہ آپ کی کسی بات یا کسی عمل کو پسند کریں تو آپ بتائیں کہ یہ میری ذاتی خوبی نہیں ہے، یہ ہمارے مذہب کی تعلیم ہے، اس لیے ہم نے جو کچھ کیا ہے اپنا فریضہ ادا کیا ہے۔

محبت کا ایک اہم ذریعہ تحائف کا لین دین بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک دوسرے کو تحفہ دو، اس سے ایک دوسرے سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ (ادب المفرد، عن ابی ہریرہ، باب قبول الہدیہ، حدیث نمبر: ۵۹۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کا ہدیہ قبول بھی فرمایا ہے اور ان کو ہدیہ دیا بھی ہے، امام محمدؒ نے لکھا ہے:

"اس میں کوئی حرج نہیں کہ مسلمان کسی حربی یا ذمی غیر مسلم کو تحفہ دے اور اس کا تحفہ قبول کرے اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قحط کے موقع پر پانچ سو دینار مکہ بھیجا اور حکم دیا کہ اسے سفیان بن حرب اور صفوان بن امیہ کے حوالہ کیا جائے تاکہ وہ اسے مکہ کے فقراء پر تقسیم کردیں اور اس لیے کہ صلہ رحمی ہر دین میں قابل تعریف ہے اور دوسرے کو تحفہ دینا مکارم اخلاق میں سے ہے۔ (ردالمختار:۲/۳۵۲، بحوالہ سیر کبیر)

اس لیے وقتاً فوقتاً جان پہچان کے غیر مسلم بھائیوں اور دوستوں کو تحفہ پیش کرنا چاہیے، خاص کر ان مواقع پر جن میں تحائف پیش کیے جاتے ہیں جیسے شادی، بچہ کی پیدائش، تعلیم کی تکمیل، کسی اعزاز کا حاصل ہونا وغیرہ۔ اسی طرح اگر خود آپ کے یہاں کوئی خوشی کی بات پیش آئے، آپ کسی اہم سفر سے واپس آئیں یا اس طرح کا کوئی اور موقع ہو، جس میں آپ اپنے دوستوں کو تحائف دیتے ہوں تو ایسے موقع پر غیر مسلم دوست کو فراموش نہ کریں، یہ بات انشاء اللہ محبت کا تخم بونے کا ذریعہ بنے گی اور سماجی زندگی میں خوشگوار تعلقات قائم ہوسکیں گے۔ اسی طرح کا ایک عمل دعوت اور مہمان نوازی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہمان نوازی کی ترغیب دی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ مہمان کا اکرام کرے۔ (بخاری عن ابی ہریرہ، حدیث نمبر ۶۰۱۸)

وقتاً فوقتاً جان پہچان کے غیر مسلم بھائیوں اور دوستوں کو تحفہ پیش کرنا چاہیے، خاص کر ان مواقع پر جن میں تحائف پیش کیے جاتے ہیں جیسے شادی، بچہ کی پیدائش، تعلیم کی تکمیل غیرہ۔ اسی طرح اگر خود آپ کے یہاں کوئی خوشی کی بات پیش آئے، آپ کسی اہم سفر سے واپس آئیں یا اس طرح کا کوئی اور موقع ہو، جس میں آپ اپنے دوستوں کو تحائف دیتے ہوں تو ایسے موقع پر غیر مسلم دوست کو فراموش نہ کریں، یہ بات انشاء اللہ محبت کا تخم بونے کا ذریعہ بنے گی اور سماجی زندگی میں خوشگوار تعلقات قائم ہوسکیں گے۔ اسی طرح کا ایک عمل دعوت اور مہمان نوازی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہمان نوازی کی ترغیب دی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ مہمان کا اکرام کرے۔

مہمان کی دونوں شکلیں ہوسکتی ہیں: ایک یہ کہ آپ کی دعوت کے بغیر کوئی شخص خود آپ کا مہمان بنے، دوسری شکل یہ ہے کہ آپ دعوت دے کر کسی کو اپنا مہمان بنائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں غیر مسلم بھائیوں کی ضیافت کی دونوں صورتیں ملتی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کے ساتھ مہمان جیسا سلوک فرمایا، بنونجران کے عیسائی وفد کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور اپنا مہمان بنایا اور بھی بہت سے غیر مسلم وقتاً فوقتاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان بنا کرتے تھے بلکہ ۹ ہجری تو عام الوفود ہی کہلاتا ہے جس میں غیر مسلموں کے بہت سے وفود آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ سے تبادلہ خیال کیا، ایمان لائے یا معاہدات کیے۔ یہ سب آپؐ کے مہمان ہوتے تھے۔ ۷ ہجری میں عمرۃ القضا کے موقع پر آپؐ نے حضرت میمونہؓ سے مکہ مکرمہ میں نکاح فرمایا اور اہل مکہ کو دعوت دی کہ وہ ولیمہ میں شرکت کریں، یہ اور بات ہے کہ انھوں نے شرکت سے انکار کردیا۔ (فتح الباری:۹/۲۳۸)

جیسے آپؐ نے غیر مسلموں کی دعوت اور ضیافت فرمائی ہے اسی طرح آپؐ نے خود بھی غیر مسلموں کی دعوت قبول کی ہے۔ اس سلسلے کا ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ ایک یہودی خاتون نے آپؐ کو مدعو کیا اور کھانے میں زہر ملا دیا جس کا اثر مرض وفات تک آپؐ پر رہا۔ یہ بات بھی ثابت ہے کہ آپؐ نے بعض غیر مسلم قبائل سے جن شرطوں پر معاہدہ کیا، ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو مسلمان اس علاقہ سے گزریں گے وہ اس کی میزبانی کریں گے کیونکہ اس زمانہ میں آجکل کی طرح ہوٹل اور بازار موجود نہیں تھے اور عربوں کے رواج میں مقامی لوگوں کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ مسافروں کے لیے کھانے کا انتظام کریں۔

لہٰذا اپنی سماجی تقریبات میں غیر مسلم بھائیوں کو مدعو کیجیے، جیسے ولیمہ، عقیقہ یا کسی خوشی کے موقع پر جب دعوت کا اہتمام کیا جائے بلکہ افراد کے ساتھ ساتھ اداروں اور تنظیموں کو بھی اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ مسلمانوں کی مذہبی تنظیموں، دینی مدارس اور دوسرے اداروں کو چاہیے کہ اگر کوئی دشواری نہ ہو تو اپنے جلسوں اور پروگراموں میں غیر مسلم مذہبی قائدین کو بحیثیت مقرر اور عام غیر مسلم بھائیوں کو بحیثیت سامعین مدعو کریں، اسی طرح اگر غیر مسلم احباب دعوت دیں اور اس دعوت کا تعلق سماجی تقریبات سے ہو تو اس میں شرکت کریں اور مبارکباد دیں، یہ آمد و رفت اور ملاقاتیں فاصلوں کو کم کریں گی اور خوشگوار تعلقات کا ذریعہ بنیں گی۔

ہدیہ اور تحفہ تو اظہارِ تعلق کے لیے دیا جاتا ہے، لیکن اگر کوئی چیز ثواب کی نیت سے دی جائے تو اسی کو صدقہ کہتے ہیں۔ صدقہ جیسے مسلمان پر کیا جاسکتا ہے غیر مسلموں پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر صحابہ سے فرمایا کہ وہ صرف مسلمانوں ہی پر صدقہ کریں، اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی کہ غیر مسلموں کو ہدایت دینا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے اور مسلمانوں سے فرمایا گیا کہ تم جو بھی خیر کے لیے خرچ کروگے تم کو اس کا پورا پورا اجر دیا جائے گا۔ (البقرہ: ۲۷۲) چنانچہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام ہی مذہب والوں پر صدقہ کیا کرو۔ (نصب الرایہ:۲/۳۹۸) چنانچہ سعید بن مسیّبؒ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے ایک خاندان پر صدقہ فرمایا (حوالہ سابق) اسی لیے اس پر تو اتفاق ہے کہ نفل صدقات غیر مسلموں کو بھی دیئے جاسکتے ہیں لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صدقاتِ واجبہ بھی غیر مسلموں کو دیئے جاسکتے ہیں، صرف زکوٰۃ کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ مسلمانوں سے لی جائے اور مسلمانوں پر خرچ کی جائے۔ (تبیین الحقائق:۱/۳۰۰)

اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلم بھائیوں کو صدقۃ الفطر دیا جاسکتا ہے، ان کو قربانی کا گوشت دیا جاسکتا ہے اگر کسی چیز کی غریبوں کے لیے نذر مانی گئی ہو تو اس کو غیر مسلموں پر بھی خرچ کیا جاسکتا ہے۔ عملی زندگی میں اس کا خیال رکھنا چاہیے بالخصوص قدرتی آفات جیسے زلزلہ، سیلاب اور طوفان وغیرہ کے لیے ریلیف میں غیر مسلم بھائیوں کو شریک رکھنا چاہیے۔ اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم بیمار ہو تو اس کے علاج میں مدد کرنا، لڑکی کی شادی میں تعاون کرنا، یتیموں اور بیواؤں کے ساتھ حسن سلوک کرنا، تعلیم میں مدد کرنا، یہ سب کارِ ثواب ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ اگر یہ سلوک کیا جائے تو اس پر اجر حاصل نہیں ہوگا۔ ہمیں روزمرہ کی زندگی میں اسلام کی ان تعلیمات کا لحاظ رکھنا چاہیے تاکہ برادرانِ وطن محسوس کریں کہ مسلمان صرف اپنے لیے نہیں سوچتا ہے بلکہ وہ پوری انسانیت کے لیے سوچتا ہے۔ □□

صفحہ تحفظ ختم نبوت

مرزا غلام احمد قادیانی کی مراقی نبوت کے خدوخال

۵

اوپر نیچے کی بیماریاں: مرزا صاحب کو اوپر نیچے کی دو بیماریاں لاحق تھیں۔ ایک اوپر کے دھڑ کی اور ایک نیچے کے دھڑ کی یعنی مراق اور کثرت بول۔ (تشحیذ الاذہان۔ بحوالہ قادیانی مذہب، ص ۱۴۶)

اسی مراقی دورے کے آغاز میں مرزا نے نبوت کا دعویٰ کیا ہم کو اس دعوی نبوت پر نہ حیرت ہے اور نہ کسی طرح کا استعجاب، بلکہ اگر مرزا دعوی نبوت نہ کرتے تو حیرت ہوتی اور پھر اطباء کے تجربات پر انگلی اٹھتی اور اس کی تاویلیں کرنی پڑتیں کہ مرزا نے مراق میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اس کا ثبوت مرزا نے اپنے الفاظ میں یوں فراہم کیا ہے: ’’اور یہ دونوں مرضیں اس زمانہ سے ہیں جس زمانہ سے میں نے اپنا دعویٰ مامور من اللہ ہونے کا شائع کیا۔‘‘ (اخبار ’’بدر‘‘ قادیان۔ ج ۲، ۳۳۔ مورخہ ۷؍ جون ۱۹۰۶ء حقیقۃ الوحی۔ ص ۳۰۷، روحانی خزائن۔ ص ۳۲۰، ج ۲۲)

مراقی کرشمے: مرزا صاحب کا مراق صرف دعویٰ نبوت تک محدود نہیں رہا۔ اس کے

اگر مرزا دعوی نبوت نہ کرتے تو حیرت ہوتی اور پھر اطباء کے تجربات پر انگلی اٹھتی اور اس کی تاویلیں کرنی پڑتیں کہ مرزا نے مراق میں مبتلا ہو چکے تھے، اس کا ثبوت مرزا نے اپنے الفاظ میں یوں فراہم کیا ہے: ’’اور یہ دونوں مرضیں اس زمانہ سے ہیں جس زمانہ سے میں نے اپنا دعویٰ مامور من اللہ ہونے کا شائع کیا۔‘‘

نمونے زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتے ہیں۔ ان نمونوں کو آپ بھی ملاحظہ فرمائیں اور خدارا بتائیں کہ یہ مراق اور خبط ہے یا نہیں؟ عام آدمیوں سے یہ حرکتیں صادر ہوں تو وہ دیوانے اور پاگل، مرزا وہی حرکتیں کریں تو خبط و دیوانگی ہی نبوت کی علامتیں بن جائیں۔ مراقی نبوت کی شناخت دیوانگی ہی سے ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ایک نمونہ:

’’ایک دفعہ ایک شخص نے بوٹ تحفہ میں پیش کیا۔ آپ (مرزا صاحب) نے اس کی خاطر سے پہن لیا مگر ان کے دائیں بائیں کی شناخت نہ کرسکتے تھے دایاں پاؤں بائیں کی طرف کی بوٹ میں اور بایاں پاؤں دائیں طرف کی بوٹ میں پہن لیتے۔ آخر اس غلطی سے بچنے کے لیے ایک طرف کے بوٹ پر سیاہی سے نشان لگانا پڑا۔‘‘ (’’منکرین خلافت کا انجام‘‘ مصنف جلال الدین شمس قادیانی۔ ص ۹۶، ملخص سیرۃ المہدی۔ ج ۱، ص ۲۷۔ روایت نمبر ۸۳)

یہ جو دائیں بائیں پاؤں کے جوتوں کے نہ پہچاننے کی بات کہی گئی ہے اس کا مشاہدہ دو سال کے بچوں میں ہوتا ہے یا پھر مراقیوں اور خبطیوں میں، بہرحال ہم مراقی نبوت کے خدوخال میں دیکھ رہے ہیں۔ یہ مراق صرف جوتوں تک محدود نہیں ہے۔ اس کا سلسلہ دراز ہے۔ ایک جراب کی بات بھی سن لیجیے: ’’بعض اوقات زیادہ سردی میں دو دو جرابیں اوپر تلے چڑھا لیتے، جراب اس طرح پہن لیتے کہ وہ پیر پر ٹھیک نہ چڑھتی، کبھی تو سرا آگے لٹکتا رہتا اور کبھی جراب کی ایڑی کی جگہ پیر کی پشت پر آجاتی۔ کبھی ایک جراب سیدھی، دوسری الٹی۔‘‘ (سیرۃ المہدی حصہ دوم۔ ص ۱۲۶، روایت نمبر ۴۴۴۔ مصنف صاحبزدہ بشیر احمد)

یہ ہے مراقی نبوت کا کمال؟ جس میں دائیں بائیں اور الٹے سیدھے کی خبر نہیں ہوتی۔ لیکن ان کو کیا کہیے جو ان مالیخولیائی حرکتوں کے باوجود مرزا کو مسیح موعود کہتے ہیں اولاد کے بارے میں مرزا کی نبوت تسلیم کرنے کی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان کو خوشحال مستقبل کا منظر اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ البتہ اغیار کی نظر اس مراق کی طرف کیوں نہ گئی؟ ایک جماعت وجود میں کیسے آئی؟ یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔ جس کا حاصل ہے دولت کی فراوانی۔ خوشحال زندگی کی کفالت جو مرزا صاحب کی طرف سے ہوتی تھی۔ اس کا سلسلہ انگریز سرکار سے جڑا ہوا تھا۔ چنانچہ مرزا نے اپنی نبوت کو انگریزی حکومت کی ایجاد کردہ نبوت بتایا ہے اور اسی کے حوالہ سے انگریزوں کی دہائی دیتے تھے اس کا ثبوت پیش کرکے ہم پر مرزا کے مراق اور مراقی نبوت کے آثار دکھائیں گے۔ تو دیکھئے خود کشتہ پودا کا ثبوت۔

’’سرکار دولت مدار ایسے خاندان کی نسبت جس کو پچاس برس کے متواتر تجربہ سے ایک وفادار جان نثار خاندان ثابت کرچکی ہے اور جس کی نسبت گورنمنٹ عالیہ کے معزز حکام نے ہمیشہ مستحکم رائے سے اپنی چٹھیات میں یہ گواہی دی ہے کہ وہ قدیم سے سرکار انگریزی کے پکے خواہ اور خدمت گزار ہیں۔ اس خود کاشتہ پودا کی نسبت کا نہایت حزم اور احتیاط اور تحقیق اور توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو اشارہ فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ

تحریر: مولانا عبدالحفیظ رحمانی

رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو ایک خاص عنایت اور مہربانی کی نظر سے دیکھیں۔ ہمارے خاندان نے سرکار انگریزی کی راہ میں اپنے خون بہانے اور جان دینے سے فرق نہیں کیا۔‘‘ (مجموعہ اشتہارات جلد سوئم۔ ص ۲۱، از مرزا غلام احمد قادیانی۔ ثبوت حاضر ہیں، ۷۲۶)

لیجئے مطلع صاف ہوگیا کہ مرزا کی نبوت مراقی بھی ہے اور انگریزی بھی، نبوت کے میدان میں انگریز سرکار نے کھڑا کیا اور اس خود کاشتہ پودے کی آبیاری پوری توجہ سے کرتی رہی۔ اور جب ذرا بھی بے توجہی کا احساس ہوا تو مرزا نے توجہ دلائی کہ یہ ثبوت تو سرکار کی ہی کاشتہ وداشتہ ہے۔ اسی کو کہا جاتا ہے کہ ’’یک نہ شد دو شد‘‘ مراقی نبوت تو تھی ہی انگریزی بھی ہوگئی۔ انگریزوں کی سرپرستی حاصل نہ ہوتی تو رنگ چوکھا کیسے ہوتا؟ ہاں مراقی نبوت کے کچھ آثار مزید ملاحظہ فرمایئے۔

’’ایک دفعہ گھر میں ایک مرغی کے چوزہ کے ذبح کرنے کی ضرورت پیش ائی اور اس وقت گھر میں کوئی اور اس کام کو کرنے والا نہیں تھا۔ اس لیے حضرت (مرزا) صاحب اس چوزہ کو ہاتھ میں لے کر خود ذبح کرنے لگے مگر بجائے چوزہ کی گدن پر چھری پھیرنے کے غلطی سے اپنی انگلی کاٹ لی، جس سے بہت خون بہہ گیا، اور آپ توبہ توبہ کرتے ہوئے چوزہ کو چھوڑ کر کھڑے ہوئے، پھر وہ چوزہ کسی اور نے ذبح کیا۔ (سیرۃ المہدی حصہ دوم، ص ۴ روایت ۳۰۔ مصنف مرزا بشیر احمد قادیانی، قادیانی مذہب، ۱۲۶)

انگلی کاٹ لی: مراق میں یہی ہوتا ہے اور کچھ کا کچھ دیکھائی دیتا ہے حالانکہ یہی مرزا صاحب جب مراقی نہیں تھے تو سرکنڈے سے چڑیا ذبح کر لیتے تھے۔ ’’والدہ صاحبہ فرماتی تھیں کہ حضرت (مرزا) صاحب فرماتے تھے کہ ہم بچپن میں چڑیا پکڑا کرتے تھے اور چاقو نہ ہوتا تو تیز سرکنڈے سے ہی حلال کرلیتے۔‘‘ (سیرۃ المہدی حصہ دوم، ص ۴۵ روایت ۵۱۔ مصنف صاحبزادہ مرزا بشیر)

کہاں تو یہ تیزیٔ طبع کہ سرکنڈے سے چڑیا حلال کرتے تھے اور کہاں اتنا زبردست مالیخولیا اور مراق کے الٹے سیدھے کی تمیز کھو بیٹھتے۔ ملاحظہ فرمایئے: ’’ایک دفعہ کوئی شخص آپ کے لیے گرگابی لے آیا۔ آپ نے پہن لی۔ اس کے الٹے سیدھے پاؤں کا آپ کو پتہ نہیں لگتا تھا۔ کئی دفعہ الٹی پہن لیتے تھے اور پھر تکلیف ہوتی تھی، بعض دفعہ آپ کا الٹا پاؤں پڑ جاتا تو تنگ ہوکر فرماتے ان (انگریز) کی کوئی چیز بھی اچھی نہیں ہے۔ والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ میں نے آپ کی سہولت کے واسطے الٹے سیدھے پاؤں کی شناخت کرکے نشان لگادیئے تھے مگر باوجود اس کے آپ الٹا سیدھا پہن لیتے تھے۔‘‘ (سیرۃ المہدی حصہ دوم، ص ۶۷ از مرزا البشیر)

کوئی بتائے تو سہی کہ جو آدمی جوتے گرگابی کے الٹے سیدھے کی تمیز نہ کرسکتا ہو، نہ پیروں کو محسوس ہوتا ہو نہ آنکھ سے سوجھائی دیتا ہو کیا اس کی نبوت مراقی نہیں ہے؟ آخر مالیخولیائی نبوت کے لیے اور کیا کیا ثبوت درکا ہیں؟ مراق کی حد تو یہ ہے کہ مرزا صاحب کو اپنے حاملہ ہونے کا یقین تھا۔

مرزا کو حمل ہوگیا: اس کی تفصیل اس قدر دلچسپ ہے کہ آپ بھی مرزا صاحب کے مراق کو داد دیں گے اور اگر ان کے مالیخولیائی ہونے میں ذرا بھی تذبذب رہا ہوگا تو یقین میں بدل جائے گا۔ لیکن ہمت کرکے پڑھیے:

’’اسی طرح میری کتاب اربعین نمبر ۴، ص ۱۹ میں بابو الٰہی بخش صاحب کی نسبت یہ الہام ہے یعنی بابو الٰہی بخش چاہتا ہے کہ تیرا حیض دیکھے یا کسی پلید اور ناپاکی پر اطلاع پائے مگر خدا تعالیٰ تجھے اپنے انعامات دکھلائے گا۔ جو متواتر ہوں گے اور تجھ میں حیض نہیں بلکہ وہ بچہ ہوگیا، ایسا بچہ جو بہ منزلہ اطفال اللہ ہے۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی، ص ۱۴۳۲۔ روحانی خزائن، ص ۵۸۱، ج ۲۲ مصنف مرزا غلام احمد قادیانی)

دیکھا آپ نے کہ مرزا کے مراقی الہام میں جنس تبدیل ہوگئی۔ مرد سے عورت ہوئے اور بچہ کی ولادت کا انتظار ہونے لگا، لیکن عورتوں کے جو مخصوص حالات ہوتے ہیں، حیض آنا، مرد وزن کا جنسی اختلاط ہونا، استقرار کے بعد حیض بند ہوجانا، مرزا کو یہ حالات پیش نہیں آئے، نہ انھوں نے حیض دیکھا اور نہ ہی دردزہ کا لطف اٹھایا پھر بھی بچہ ہوگیا، وہ کس طرح ہوا اور دایہ کون بنی اس کا کوئی ذکر مرزا نے نہیں کیا البتہ بچہ ہو وہ بھی ’’خدا کے بچوں کے منزلہ میں‘‘ العیاذ باللہ! ہاں ایک بات رہ گئی کہ جنسی اختلاط کس سے ہوا تھا اور کیا آج تک کسی مرد کے بطن سے کسی بچہ کا تولد ہوا ہے۔ توالد وتناسل کی تاریخ میں ایسا کوئی عجوبہ نظر نہیں آتا اس کی بھی تفصیل کہیں نہیں ملی کہ مرزا صاحب نے یورپین منچلوں کی طرح کسی اسپتال مین جنس تبدیل کرائی ہے۔ ان کی اہلیہ محترمہ نے بھی اس کو راز ہی رکھا لیکن مرزا صاحب جب امید سے ہوگئے تو انھوں نے خود ہی راز فاش کردیا اور فرمایا: ’’حضرت مسیح موعود نے ایک موقع پر اپنی حالت ظاہر فرمائی ہے کہ کشف کی حالت آپ پر اس طرح طاری ہوئی کہ گویا آپ عورت ہیں اور اللہ تعالیٰ نے رجولیت کی قوت کا اظہار فرمایا۔ سمجھنے والے کے لیے اشارہ کافی ہے۔ (ٹریکٹ نمبر ۳۴، اسلامی قربانی، ص ۱۲۔ مصنف قاضی یار محمد صاحب قادیانی مطبوعہ الہند پریس امرتسر)

مشرکوں کے عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ ہے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ اسلام نے اس عقیدہ کی پرزور تردید کی ہے اور توالد وتناسل کی نسبت کو بدترین الزام قرار دیا ہے۔ لیکن مرزا صاحب کا مراق اور مالیخولیا کہاں تک پہنچ گیا۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے دل لرزتا اور قلم کانپتا ہے۔ یہ تو قادیانیوں کا ہی دل گردہ ہے جو یہ کہتے ہوئے ذرا بھی نہ شرمائے اور نہ بعد میں پچھتائے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی جناب مین کیسی بدترین گستاخی

مشرکوں کے عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ ہے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ اسلام نے اس عقیدہ کی پرزور تردید کی ہے اور توالد وتناسل کی نسبت کو بدترین الزام قرار دیا ہے۔ لیکن مرزا صاحب کا مراق اور مالیخولیا کہاں تک پہنچ گیا۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے دل لرزتا اور قلم کانپتا ہے۔

کررہے ہیں۔ قاضی یار محمد قادیانی کا یہ جملہ کہ ’’اور اللہ تعالیٰ نے رجولیت کی قوت کا اظہار فرمایا، سمجھنے والے کے لیے اشارہ کافی ہے۔‘‘ اس بدترین اور شرمناک الہام پر عقل وخرد سرنگوں اور شرافت دم بخود ہے۔ لیکن ابھی مزید ہمت کرکے مراقی نبوت کا دو ایک الہام اور پڑھ لیجئے اور دیکھئے کہ مراق کے کیسے کیسے رنگ ہوتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے: ’’مریم کی طرح عیسیٰ کی روح مجھ میں نفخ کی گئی اور استعارہ کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھہرا دیا گیا...... اور آخر کئی مہینے کے بعد جو دس مہینے سے زیادہ نہیں، بذریعہ اس کے...... مجھے مریم سے عیسیٰ بنایا گیا پس اس طور سے میں ابن مریم ٹھہرا۔‘‘ (کشتی نوح، ص ۴۷، روحانی خزائن، ص ۵۰، ج ۱۹۔ مصنف مرزا غلام احمد قادیانی) (جاری)

جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ کی

حیات وخدمات پر مشتمل

ہفت روزہ الجمعیۃ دھلی کی

خصوصی اشاعت

مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ نمبر

اپنی تمام تر خوبیوں، بھترین مضامین، شاندار طباعت اور دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ منظر عام پر آچکا ھے۔

صفحات ۱۹۶ | سائز: ۲۳×۳۶ / ۸ | قیمت -/150

رابطہ: ہفت روزہ الجمعیۃ، مدنی ہال (بیسمنٹ) ۱ بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی ۲

موبائل: 09868676489

ہفت روزہ الجمعیۃ نئی دہلی کی

خصوصی پیشکش

تحفظ ختم نبوت نمبر

انشاء اللہ العزیز انتہائی آب وتاب کے ساتھ بہت جلد منظر عام پر آرہا ہے

مکمل تفصیلات آئندہ ملاحظہ فرمائیں

رابطہ: ہفت روزہ الجمعیۃ، مدنی ہال (بیسمینٹ) ۱ بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی ۲

موبائل: 09868676489 — ای میل: aljamiatweekly@gmail.com

آزاد ہندوستان میں سیاست میں شفافیت کی ضرورت

تحریر: مولوی عبدالواسع علیگ

آج اُبھرتے ہوئے بھارت کو ضرورت ہے ایک ایسے سماج کی جو بدعنوانی اور جرائم سے پاک ہو اور ہر طبقہ پرسکون زندگی بسر کرسکے۔ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ لوگ نہیں چاہتے کہ پارلیمنٹ اسمبلیوں اور میونسپل کارپوریشنوں میں ایسے لوگ منتخب ہوکر جائیں جن پر مجرمانہ الزامات ہوں، چنانچہ اب لوگ یہ بھی دیکھنے لگے ہیں کہ جو امیدوار میدان انتخاب میں ہیں وہ کیسے کردار کا ہے تاکہ صاف ستھری شبیہ کے امیدواروں کا انتخاب کیا جاسکے لیکن اس بیداری کے باوجود ایسے امیدوار منتخب ہوتے رہے ہیں جنھیں داغی سمجھا جاتا ہے یعنی جن کی شبیہ صاف ستھری نہیں، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اچھی شبیہ والے امیدواروں کے انتخاب کے لیے عام لوگوں کا بیدار ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ داغی لوگوں کو انتخاب کے میدان میں اُترنے ہی نہ دیا جائے۔ اسی سلسلے میں گزشتہ دنوں سپریم کورٹ میں ایک پٹیشن داخل کی گئی تھی جس میں عدالت عالیہ سے درخواست کی گئی تھی کہ حساس فوجداری معاملوں میں ملوث ملزمین پر الیکشن لڑنے پر پابندی عائد کی جائے مگر عدالت نے اس معاملے میں اپنا فیصلہ سناتے ہوئے ایسی کوئی پابندی عائد کرنے سے انکار کردیا اور کہا کہ ایسے ملزموں کو نااہل قرار دینے کی ذمہ داری ہماری نہیں ہے۔

سپریم کورٹ نے کہا کہ اس پر پارلیمنٹ میں قانون بننا چاہیے کیونکہ ایسے لیڈران کو نااہل قرار دینا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ سپریم کورٹ نے واضح طور پر کہا کہ وہ قانون سازی کے دائرے میں جاکر داغی لیڈران کو الیکشن لڑنے سے روک کر اپنی حد کو پار نہیں کرسکتا۔ واضح رہے کہ سپریم کورٹ میں عرضی داخل کی گئی تھی کہ پانچ سال یا اس سے زیادہ سزا کے معاملے میں الزام طے ہونے کے بعد لیڈران کو الیکشن لڑنے سے روکا جائے جس پر چیف جسٹس دیپک مشرا کی بنچ نے سماعت کرتے ہوئے مذکورہ بالا فیصلہ سنایا۔ چیف جسٹس نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سیاست میں جرائم اور بدعنوانی کا فروغ پانا جمہوریت کے لیے بڑا خطرہ ہے چنانچہ اس پر قدغن لگنی چاہیے، حالانکہ سپریم کورٹ نے داغی لیڈران کو الیکشن کے لیے نااہل قرار دینے سے انکار کردیا ہے تاہم اس نے کچھ سخت ہدایات ضرور دی ہیں اور پارٹیوں کو خبردار بھی کیا ہے۔ سپریم کورٹ نے کہا کہ جن لیڈران کے کریمنل کیس التوا میں ہوں، وہ کاغذات نامزدگی داخل کرتے وقت جب اپنا حلف نامہ داخل کریں تو کریمنل کیس کے بارے میں جلی حروف میں لکھیں۔ سپریم کورٹ نے کہا کہ رائے دہندگان کو یہ پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ جانیں کہ امیدوار کا مجرمانہ ریکارڈ کیا ہے۔ عدالت عظمیٰ نے کہا کہ اگر کوئی امیدوار الیکشن کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو سیاسی جماعت کے ذریعہ تفصیل سے لوگوں کو بتائے۔ سپریم کورٹ نے اپنے فیصلہ میں یہ بھی کہا کہ سیاسی جماعت داغی امیدوار کے بارے میں پرنٹ اور الیکٹرانک سبھی قسم کے اشتہارات میں اس کی معلومات فراہم کرائے۔ سپریم کورٹ نے اپنے فیصلہ میں کہا کہ سبھی سیاسی پارٹیوں کو اپنی ویب سائٹ پر سبھی امیدواروں کے مجرمانہ ریکارڈ کی معلومات فراہم کرانی ہوگی۔ علاوہ ازیں چیف جسٹس نے سیاست میں فروغ پارہی بدعنوانی اور جرائم پر تشویش کا بھی اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ملک کی جمہوریت کے لیے خطرناک ہے اور یہ اقتصادی دہشت گردی ہے۔ واضح رہے کہ تقریباً ۱۵۱۸ لیڈران پر فوجداری کے مقدمات درج ہیں جن میں سے ۵۰ کے قریب رکن پارلیمنٹ ہیں۔ رپورٹ کے مطابق ۳۵ لیڈران پر آبروریزی، قتل اور اغوا جیسے سنگین مقدمات درج ہیں۔ رپورٹ کے مطابق مہاراشٹر کے ۶۵، بہار کے ۶۲ اور مغربی بنگال کے ۵۲ لیڈران پر اس قسم کے مقدمات درج ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے فیصلے سے کچھ پارٹیاں اتفاق نہیں رکھتیں جبکہ حکومت ہند نے سپریم کورٹ میں دورانِ سماعت یہ بات کہی تھی کہ قانون بنانے کا کام پارلیمنٹ کا ہے۔ دورانِ سماعت اٹارنی جنرل کے وینوگوپال نے حکومت ہند کی جانب سے پیش ہوتے ہوئے کہا کہ یہ قانون بنانا پارلیمنٹ کے اختیار میں ہے چنانچہ سپریم کورٹ کو قانون سازی کے معاملہ میں دخل نہیں دینا چاہیے، حکومت ہند کی جانب سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ عدالت کی نیت قابل ستائش ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عدالت یہ کرسکتی ہے؟ اٹارنی جنرل کے حساب سے عدالت یہ کام نہیں کرسکتی کیونکہ یہ اس کے دائرے سے باہر کی چیز ہے۔ حکومت ہند کی جانب سے یہاں تک عدالت میں کہا گیا تھا کہ آئین کہتا ہے کہ کوئی شخص تب تک بے گناہ ہے جب تک وہ مجرم قرار نہ دیا گیا ہو۔ یاد رہے کہ اسی بحث کے دوران سپریم کورٹ نے یہ بھی کہا تھا کہ الیکشن کمیشن ایسا نظام قائم کرسکتا ہے کہ جو لوگ کریمنل بیک گراؤنڈ کے ہیں، ان کے بارے میں تفصیل عام کردی جائے۔ اس پر حکومت ہند کی جانب سے وینوگوپال نے پٹیشن کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ جہاں تک سزا سے پہلے ہی الیکشن لڑنے اور پابندی لگانے کا سوال ہے تو کوئی بھی آدمی تب تک بے گناہ ہے کہ جب تک کورٹ اسے سزا نہیں دے دیتا۔

اس طرح یہ معاملہ التوا میں چلا گیا اور آئندہ

> **کیا سیاسی پارٹیوں پر سپریم کورٹ کی رہنما ہدایات کا کوئی اثر ہوگا شاید اس کا جواب نفی میں ہوگا کیونکہ اس سے قبل بھی سیاست میں شفافیت کے حوالہ سے عدلیہ اپنا رُخ صاف کرچکا ہے لیکن اس کے اثرات کہیں نظر نہیں آتے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حمام میں سبھی ننگے ہیں اس لیے سب ایک دوسرے کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔**

کئی سال تک اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں نکل پائے گا کیونکہ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ جرائم پیشہ حضرات جو کہ اس وقت ایوانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے خاندان کے لوگ یا پھر آنے والی نسلیں بھی ان ایوانوں کی زینت بنیں وہ اس قسم کا قانون پاس نہیں ہونے دیں گے کیونکہ ان کی آئندہ آنے والی نسلیں بھی ان کے نقش قدم پر چل رہی ہیں۔

ہماری ناقص رائے کے مطابق تو کمیشن کو ہدایات جاری کرنی چاہئیں کہ امیدوار کم سے کم گریجویٹ ہو اور یہ ہونا بھی چاہیے کیونکہ ان ایوانوں کے ممبر کا اصل کام قانون بنانا ہوتا ہے اور قانون وہ ہی بناسکتا ہے جو پڑھا لکھا ہو۔ یہ ہدایت دودھاری تلوار کا کام کرے گی کیونکہ اس حقیقت سے ہم سب واقف ہیں کہ ۹۹ فیصد جرائم پیشہ لوگ پڑھے لکھے نہیں ہوتے۔ اس طرح یہ لوگ خود بخود سیاست سے باہر ہوجائیں گے۔

ہماری تجویز یہی ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ انتخابات میں قسمت آزمائی کرنے والے امیدواروں کے لیے تعلیمی قابلیت کا معیار قائم ہونا چاہیے۔ یہ ضرور ممکن ہے کہ مختلف مراحل کے لیے مختلف معیار کا تعین ہو یعنی کہ پارلیمنٹ کا انتخاب لڑنے کے لیے امیدوار کے لیے گریجویٹ ہونا ضروری ہونا چاہیے۔ اسمبلی انتخابات کے لیے بارہویں اور کارپوریشن و پنچایت کے لیے دسویں تک پاس ہونا ضروری ہونا چاہیے۔ اگر اس تجویز پر کام کیا جائے تو ہمارے اندازے کے مطابق ۹۵ فیصد جرائم پیشہ افراد سیاست سے باہر ہوجائیں گے۔ ایک دوسرا طریقہ ان لوگوں کو سیاست سے دور رکھنے کا یہ ہوسکتا ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص جس پر فوجداری مقدمات قائم ہیں وہ انتخابات میں حصہ لیتا ہے اور وہ کامیاب بھی ہوجاتا ہے تب اس کے لیے فاسٹ ٹریک عدالت سے اپنا مقدمہ ایک مقررہ مدت میں متصل کرانا لازمی قرار دیا جائے یعنی کہ اگر کسی شخص پر قتل کا مقدمہ قائم ہے وہ الیکشن میں کامیاب ہوجاتا ہے تب اس کے لیے لازم ہونا چاہیے کہ وہ فاسٹ ٹریک کورٹ سے رجوع کرے اور اس کورٹ کو چھ ماہ کے اندر اس معاملہ پر اپنا فیصلہ دینا ضروری ہو، اور اگر فیصلہ ایسے امیدوار کے خلاف آجاتا ہے تب الیکشن کمیشن اسے نااہل قرار دے، چاہے وہ اس فیصلے کے خلاف اپیل کرتا رہے۔ سردست سپریم کورٹ نے انتخابی فارم میں جرم کی معلومات فراہم کرنے کی بات کہی ہے نیز پارٹیاں بھی اپنے امیدوار پر عائد الزامات کی معلومات فراہم کرائیں۔ آئینی بنچ نے کچھ رہنما ہدایات جاری کیں مثلاً چناؤ لڑنے والوں کو اپنے مجرمانہ پس منظر کی معلومات موٹے حروف میں دینی چاہئیں، سیاسی پارٹیاں اپنی ویب سائٹ پر ایسی معلومات دیں ساتھ ہی میڈیا میں بھی اس کی تشہیر ہو، عدالت نے صاف طور پر کہا کہ سیاست کو جرائم سے پاک کرنے کے لیے پارلیمنٹ کو آگے آنا چاہیے۔ الیکشن کمیشن بھی ۱۹۹۷ء اور ۱۹۹۹ء کے لاء کمیشن میں عوامی نمائندگی قانون میں ترمیم کی وکالت کرچکا ہے لیکن حکومت اس کے حق میں نہیں ہے، اس نے عدالت میں اس درخواست کی مخالفت کی تھی، اس کا موقف ہے کہ قصوروار ثابت ہونے تک انتخابات میں حصہ لینے سے روکا نہیں جاسکتا۔ حکومت نے ابتدا میں زور شور کے ساتھ کہا تھا کہ ہم سیاست کو جرائم سے پاک کرنے کے لیے عملی اور تیز رفتار اقدامات کریں گے۔ شاید اسی لیے عدالت سے استفسار کیا کہ عوامی نمائندوں کے مقدمات کی سماعت کے لیے کتنے خصوصی فاسٹ ٹریک کورٹ قائم ہوئے اور کتنے ممبرانِ اسمبلی و پارلیمنٹ کے خلاف کتنے کیس زیر التوا ہیں نیز خصوصی عدالتوں میں کتنے کیس منتقل ہوئے ہیں۔

کیا سیاسی پارٹیوں پر سپریم کورٹ کی رہنما ہدایات کا کوئی اثر ہوگا شاید اس کا جواب نفی میں ہوگا کیونکہ اس سے قبل بھی سیاست میں شفافیت کے حوالہ سے عدلیہ اپنا رُخ صاف کرچکا ہے لیکن اس کے اثرات کہیں نظر نہیں آتے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حمام میں سبھی ننگے ہیں اس لیے سب ایک دوسرے کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ چندے کے معاملے میں یہ اتحاد خاص طور سے نظر آتا ہے۔ کوئی بھی پارٹی نہیں چاہتی کہ چندے کی تفصیلات عام ہوں اس لیے کوئی قانون پاس نہیں ہوسکا۔ چندے کے ذرائع پر موٹا پردہ پڑا ہونے کی وجہ سے بدعنوانیوں کو راستہ ملتا ہے اور ناجائز و غیر قانونی طریقے سے کام کرنے اور کرانے کی راہ ہموار ہوتی ہے، پھر جرائم پیشہ عناصر سیاسی پارٹیوں کو پیسہ کے ساتھ طاقت بھی فراہم کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس معاملے میں کسی پارٹی کا دامن صاف نہیں ہے۔ ہر پارٹی میں داغی مافیا عناصر کثرت کے ساتھ موجود ہیں اگر سیاسی پارٹیاں دل سے چاہیں تو سیاست کو پاک وصاف بنانا مشکل نہیں ہے۔ اس وقت چیلنج یہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نہیں ہے جس کے تحت مجرمانہ پس منظر رکھنے والوں کو الیکشن لڑنے سے روکا جاسکے۔ ان کو نااہل قرار دیا جاسکے۔ برسوں گزر گئے، باتیں بہت کرتے ہیں، اصولی طور پر ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اس لیے آئینی بنچ نے صاف طور پر یہ ذمہ داری پارلیمنٹ کو سونپ کر عوامی نمائندوں کو کٹھہرے میں کھڑا کردیا ہے، دیکھنا ہے کہ وہ اس کسوٹی پر کھرے اترے ہیں یا نہیں۔ □□

مجاہد آزادی چودھری ریاست علی سنبھلی

جنھیں ہم نے بھلا دیا

تحریر: الحاج حماد احمد ایڈوکیٹ

روہیل کھنڈ جیسے تاریخ ساز خطے کے ضلع مرادآباد سے ۳۵ کلومیٹر کے فاصلے پر آباد قدیم ترین قصبہ سنبھل (حالیہ نام بھیم نگر) عہد قدیم میں منفرد اور ممتاز حیثیت کا حامل رہا ہے۔ پرتھوی راج چوہان کے زمانے میں سنبھل کو راجدھانی کا فخر حاصل ہوا۔ مسلم سلاطین کے عہد حکومت میں بھی اس کی بحثیت برقرار رہی۔ برطانوی عہد حکومت میں سنبھل کا زوال شروع ہوا۔ عظمت پارینہ گھٹنے لگی۔ یہ تاریخ ساز خطہ سنبھل جہادِ آزادی کی تاریخ میں بھی مرکزی کردار کا حامل رہا ہے۔ مادرِ وطن کو غلامی کے شکنجے سے آزاد کرانے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ رکھنے والوں کی کمی نہیں رہی۔ تحریک آزادی میں یہاں کے جیالوں نے نہ صرف تن من دھن کی قربانیاں دیں بلکہ اگلی منازل طے کرنے میں بھی پیچھے نہ رہے اور آزادی کے لیے عظیم الشان کارنامے انجام دیئے۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ بیشتر مجاہد آزادی کے حیات و کارنامے وقت کے دبیز پردوں میں چھپ گئے ہیں، اگر ان گمشدہ خزانوں کو تلاش کیا جائے تو ہمارے لیے مشعل راہ کا نام دیں گے۔

انگریزوں کی شاطرانہ چالوں نے ہندستان کو غلامی کی ایسی زنجیروں میں جکڑ لیا اور ہندستانیوں پر جور وستم کی انتہا کردی جن کو ضبط تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔ سارے ملک میں اضطراب اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ مادرِ وطن کے سپوتوں میں احساسِ آزادی بیدار ہونے لگا۔ سارے ملک کی طرح سنبھل میں بھی جذبہ قومی پوری شدت سے اُبھرا۔ حریت پسند محبّ وطن باشندوں نے غلامی کے خلاف سر سے کفن باندھ کر میدانِ عمل میں آنے کی جرأت کی۔ مادرِ وطن کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں سب کچھ لٹا دینے والے سرفروشانِ وطن میں سے ایک پرعزم نام چودھری ریاست علی خاں کا ہے۔ اس مختصر تحریر میں اُن کے حیات و کارناموں پر سرسری نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یوں تو دُنیا میں انگنت لوگ آتے اور چلے جاتے ہیں لیکن ان میں کچھ خاص شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو کبھی نہ مٹنے والے نقوش، کبھی نہ بھولنے والی یادیں اور کبھی نہ سوکھنے والا عظمتوں کا سمندر چھوڑ جاتے ہیں۔ دراصل ان کی رفعتوں، عظمتوں اور بلند کرداری کے ایسے اعلیٰ اور بیش بہا نمونے معاشرے کی جڑوں میں پیوست ہوجاتے ہیں جن کو نظرانداز کرنا ایک عام انسان کیا خواص تک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ایسی ہی منفرد اور جاں نواز شخصیت تھے چودھری ریاست علی خاں جن کو ہم سے جدا ہوئے ایک لمبا عرصہ گزر چکا ہے لیکن ان کی یادیں آج بھی زندہ ہیں۔ ان کا تعلق چودھری سرائے کے ایک معزز ذی حیثیت خاندان سے تھا۔ ان کے والد چودھری ممتاز علی خاں مسلم راجپوت تھے اور عمائدین شہر میں شمار کیے جاتے تھے۔ ۱۸۹۴ء میں اس گھر میں ایک ایسے سپوت نے جنم لیا جو بعد میں چودھری ریاست علی خاں کے نام سے مشہور وممتاز ہوا۔ ابتدائی تعلیم دستورِ زمانہ کے مطابق گھر پر ہوئی۔ زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولنے کے باعث اعلیٰ تعلیم سے مرحوم رہے۔ عیش وعشرت کے ماحول میں پروان چڑھنے کے باوجود بچپن سے ہی وطن پرستی کا جذبہ دل میں جاگزیں تھا۔ وقت اور حالات نے ان جذبات کو مزید ہوا دی۔

جب اُن کی عمر بیس سال کی ہوئی تو میدانِ کارزار میں کود پڑے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سنبھل میں تحریک آزادی عہد طفلی سے عہد شباب میں داخل ہوچکی تھی۔ لالہ روپ کشور، لالہ چندولال، مولانا محمد اسماعیل، مولوی عبدالقیوم، مولوی عبدالوحید وغیرہ برطانوی سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے میں پیش پیش تھے۔ یہاں کا ہر فرد متاثر ہو رہا تھا۔ ان میں چودھری ریاست علی بھی شمع آزادی کو لے کر سڑکوں پر گھومتے تھے اور پولیس ان نوجوانوں کا لاٹھی ڈنڈوں سے استقبال کرتی تھی لیکن ان کا جذبہ کم نہیں ہوتا تھا۔ یوں کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ انگریز ان پر مظالم ڈھاتے رہے لیکن یہ جنگ آزادی کا مجاہد ان کی آنکھوں میں بری طرح کھٹک رہا تھا۔ انگریز آقا انھیں تہ تیغ کرنے کی گھات میں تھے۔ اُن پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ عیاری ومکاری سے بھی کام لیا گیا اور ہر وہ طریقہ اپنایا گیا جو اُن کے راستے میں رکاوٹ بنتا لیکن اس تحریک آزادی کے پائے استقامت میں لغزش نہیں ہوئی بلکہ نئی توانائی اور نئے عزائم کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔

خلافت تحریک نے آزادی کی تحریک میں نئی روح پھونک دی جس کے روحِ رواں چودھری ریاست علی خاں تھے۔ ان کی محنت سے تحریک خلافت عوامی تحریک بن گئی اور عوام انگریزوں سے نفرت کرنے لگے اور تحریک آزادی کا جذبہ عوام میں عام ہونے لگا۔ انگریز آقاؤں نے ان کے لیے جیل خانے کے دروازے کھول دیئے۔ اس وقت دستور کی دفعہ ۱۷ کے تحت گرفتار کرلیے گئے اور مرادآباد جیل میں قید کردیا گیا۔ ۸؍اپریل ۱۹۲۲ء کو رہائی نصیب ہوئی۔ رہا ہونے کے بعد پھر اپنے مشن میں لگ گئے۔ تحریک آزادی اور انگریزوں کے خلاف عظیم بغاوت بلند کرکے جذبہ آزادی کو بیدار کرنے کا کام جاری رہا۔ ۲۶؍اکتوبر ۱۹۲۳ء کو دوبارہ گرفتاری عمل میں آئی اور دوسال قید بامشقت کی سزا ملی۔ جیل میں بان بٹنے اور چکی پیسنے کا کام سپرد ہوا اور طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں۔ جیل سے رہائی کے بعد چودھری ریاست علی خاں نے زمینداری سے کنارہ کشی اختیار کرکے فقیری لے لی اور آخری سانس تک قومی

(باقی صہ۱۴ پر)

آزاد ہندستان میں قانون ساز اداروں میں مسلمانوں کی روز افزوں گھٹتی ہوئی نمائندگی: ایک سوالیہ نشان

سیاسی مبصر کے قلم سے

پارلیمنٹ میں مسلمانوں کے کم تعداد میں پہنچنے کی وجوہات کا سب سے زیادہ ذمہ دار ملک کا ڈی لمی نیشن قانون ہے جو مسلمانوں کے لوک سبھا تک پہنچنے میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ دراصل صدرِ جمہوریہ ہند نے ۱۹۵۰ء میں آئین کی دفعہ ۳۴۱ کے تحت کانسٹی ٹیوشن (شیڈول کاسٹ) آرڈر ۱۹۵۰ء جاری کیا تھا، جس کے بعد ملک میں یہ قانون نافذ ہوا، جو کہ ملک کے سیکولر آئین کی سراسر خلاف ورزی ہے کیونکہ اس کے تحت صرف ہندوؤں کو ہی انتخابی حلقوں میں ریزرویشن کا مجاز سمجھا گیا اور مسلمانوں اور عیسائیوں کو اس سے خارج کردیا گیا۔

نظام میں آپ کی آواز ہی آپ کی مضبوطی ہوتی ہے۔ اس نظام میں آپ کی شمولیت جتنی بڑی تعداد میں ہوگی آپ اتنے ہی خوشحال رہیں گے، لیکن مسلمان آج خود کو اس جمہوری نظام سے الگ تھلگ محسوس کررہا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہندستانی جمہوریت میں ملک کی متعدد سماجی، اقتصادی اور سیاسی سرگرمیوں سے وابستہ برادریوں اور جماعتوں کو یہ موقع حاصل ہے کہ وہ جمہوری طریقے سے انتخابی عمل میں شریک ہوں اور اس طرح گاؤں اور دیہات کی سطح پر پنچایت اور ضلع پریشد شہر اور قصبوں کی سطح پر میونسپلٹی اور کارپوریشن، ریاستی سطح پر اسمبلی اور قانون ساز کونسل اور ملکی سطح پر پارلیمنٹ میں منتخب ہوکر آئیں اور حکومتی ڈھانچوں میں شریک ہوں، لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ سیاسی اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی تشویشناک حد تک کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی گلیاروں میں ان کے مسائل کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ ظاہر ہے کہ حکومتی ڈھانچوں میں جب مسلمانوں کی حالت اتنی کمزور ہے تو پھر ان کے مسائل کو حل کرنے سے متعلق قانون کیسے بنیں گے اور اگر یہ قانون بنے بھی تو اس میں کتنا دم ہوگا، اس کا اندازہ ہم سبھی لگا سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی مسلسل کم ہوتی سیاسی نمائندگی پر پانچ سال قبل تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کانسٹی ٹیوشن ریویو کمیشن کے چیئرمین جسٹس وینکٹ چلیا نے ہندستان کی تمام سیاسی پارٹیوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اقلیتی برادری کے درمیان قیادت کو کھڑا کرنے پر زور دیں، ورنہ وہ احساسِ بیگانگی کا شکار ہوکر رہ جائیں گے۔

موجودہ صورتِ حال کا اگر ہم گہرائی سے جائزہ لیں تو پورے ملک میں لوک سبھا کی کل ۱۵۰ سیٹیں ایسی ہیں جہاں پر مسلمان فیصلہ کن حالت میں ہیں۔ یہ سیٹیں ملک کی سولہ ریاستوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اتر پردیش میں ان لوک سبھا سیٹوں کی تعداد ۴۵ ہے تو بہار میں ۱۷، مغربی بنگال اور مہاراشٹر میں ۱۴-۱۴، کیرالہ اور کرناٹک میں ۱۰-۱۰، آندھرا پردیش اور آسام میں ۷-۷، جھارکھنڈ میں ۶، جموں وکشمیر اور گجرات میں ۵-۵، جبکہ اتراکھنڈ، دہلی، راجستھان، مدھیہ پردیش اور ہریانہ میں سے ہر ایک ریاست میں ۲-۲ لوک سبھا سیٹیں ہیں۔ گزشتہ تین لوک سبھا انتخابات میں بھی صورتِ حال تقریباً ایسی ہی تھی لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ ان ۱۵۰ سیٹوں پر فیصلہ کن حالت میں ہونے کے باوجود بھی ۲۰۰۴ء میں صرف ۳۴، ۲۹۹۰ء میں ۳۰، اور ۲۰۱۴ء میں صرف ۳۲ مسلم امیدوار ہی منتخب ہوکر لوک سبھا پہنچے تھے۔ ۱۹۵۲ء سے لے کر اب تک جتنے بھی لوک سبھا انتخابات ہوئے ان میں سے صرف ۱۹۸۰ء کے انتخابات میں دس فیصد مسلم امیدوار منتخب ہوکر لوک سبھا میں پہنچے تھے۔ یعنی چودہ فیصد سے زیادہ کی آبادی ہونے کے باوجود جو لوک سبھا میں ان کی نمائندگی ۱۹۸۰ء کے لوک سبھا انتخابات کو چھوڑ کر اب تک فیصد کے دو ہندسہ کو بھی نہیں چھوسکی۔

پارلیمنٹ میں مسلمانوں کے کم تعداد میں پہنچنے کی وجوہات پر اگر ہم غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے لیے جہاں مختلف سیاسی پارٹیوں کے ذریعے مسلمانوں کو کم ٹکٹ دیا جانا ایک وجہ ہے وہیں دوسری وجہ خود مسلمانوں میں قیادت کا زبردست فقدان بھی ہے لیکن اس کے لیے سب سے زیادہ ذمہ دار ملک کا ڈی لمی نیشن قانون ہے جو مسلمانوں کے لوک سبھا تک پہنچنے میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ دراصل صدرِ جمہوریہ ہند نے ۱۹۵۰ء میں آئین کی دفعہ ۳۴۱ کے تحت کانسٹی ٹیوشن (شیڈول کاسٹ) آرڈر ۱۹۵۰ء جاری کیا تھا، جس کے بعد ملک میں یہ قانون نافذ ہوا، جو کہ ملک کے سیکولر آئین کی سراسر خلاف ورزی ہے کیونکہ اس کے تحت صرف ہندوؤں کو ہی انتخابی حلقوں میں ریزرویشن کا مجاز سمجھا گیا اور مسلمانوں اور عیسائیوں کو اس سے خارج کردیا گیا۔ لوک سبھا کی اس وقت کل ۵۴۳ سیٹیں ہیں لیکن مسلمان اور عیسائی صرف ۴۱۳ سیٹوں پر ہی الیکشن لڑ سکتے ہیں کیونکہ ۸۴ لوک سبھا سیٹوں کو شیڈول کاسٹ کے لیے ریزرو کردیا گیا ہے۔ ڈی لمی ٹیشن قانون کے تحت ملک کے ایسے زیادہ تر علاقوں کو ریزروڈ کانسٹی ٹیوشن قرار دے دیا گیا جہاں پر اکثریت مسلمانوں کی ہے اور شرط یہ لگادی گئی کہ وہاں سے صرف کوئی ایس سی (شیڈول کاسٹ) امیدوار ہی الیکشن لڑسکتا ہے۔

حکومت کے اس قدم سے مسلمانوں میں یہی تاثر گیا ہے کہ انھیں جان بوجھ کر قانون ساز اداروں میں جانے سے روکنے کی کوشش کی جارہی ہے جو کہ بعد میں بڑے پیمانے پر ان کی پسماندگی کا ایک بڑا سبب بنی۔ ہندستانی مسلمانوں کے اسی احساس کو دور کرنے کے لیے سچر کمیٹی نے اس قانون پر دوبارہ غور کرنے اور اس کی خامیوں کو دور کرنے کی سفارش کی تھی۔ جسٹس وینک چلیا نے بھی تمام سیاسی پارٹیوں کو مسلمانوں کی کم ہوتی سیاسی نمائندگی کو دور کرنے کے لیے ان کے درمیان قیادت کو اُبھارنے کا مشورہ دیا تھا لیکن سیاسی پارٹیوں پر اس کا کوئی اثر پڑتا ہوا دِکھائی نہیں دے رہا ہے۔ ابھی سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے ذہن سے ان کی پسماندگی اور محرومی کے احساس کو دور کیا جائے اور جمہوریت کے تئیں ان کے اعتماد کو بحال کیا جائے۔ یہ سب تبھی ممکن ہے جب مسلمانوں کو بھی جمہوری نظام میں برابر کی حصہ داری ملے۔ قانون بنانے کے سب سے بڑی ادارہ لوک سبھا میں مسلم نمائندوں کو دیکھ کر مسلمانوں کے اس اعتماد کو آسانی سے بحل کیا جاسکتا ہے۔□□

مجاہد آزادی اودھم سنگھ

جس نے جنرل ڈائر کو کیفر کردار تک پہنچایا

تحریر: ایم قمر

اپنی تقریر ختم کرنے کے بعد جیسے ہی ڈائر اپنی کرسی پر بیٹھنے والا تھا تو اودھم سنگھ نے اپنی ریوالور کی گولیاں ڈائر کی چھاتی پر داغ دیں۔ اسی جگہ پر ڈائر کی موت ہوگئی۔ آج اودھم سنگھ کا انتقام پورا ہوگیا تھا۔ اودھم سنگھ گولی مارنے کے بعد وہاں سے فرار بھی ہوسکتا تھا مگر آزادی کا یہ پروانہ وہیں کھڑا رہا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی دلیری اور بہادری کا یہ ایک ثبوت تھا۔ اس نے یہ ثابت کردیا تھا کہ ایک انقلابی کسی بھی ظالم انگریز کو اسی کے ملک میں آکر فنا کرسکتا ہے۔

وہ تاریخ کا سیاہ دن تھا جس میں ایک پرامن تحریک کو بربریت کا شکار بنایا گیا تھا، جس حادثہ کے سامنے انسانیت شرمندہ ہوگئی تھی اور جنرل ڈائر اپنے اس غیر انسانی اقدام پر فخر کررہا تھا۔ یہ وہی جلوس تھا جس میں نوجوان اودھم سنگھ بھی موجود تھا اس نے بربریت کے ننگے ناچ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کی حب الوطنی کے جذبہ کو ایسی کراری ضرب لگی کہ اسے انگریزی حکومت اور انگریزی نظام سے سخت نفرت ہوگئی۔ اس نے ڈائر سے ظلم کا بدلہ لینے کا عہد کیا۔

ڈائر کو کیفر کردار تک پہنچانے کی دھن سوار ہونے کے بعد اودھم سنگھ مادرِ وطن کی خدمت میں لگ گیا۔ اس نے اپنی زندگی کو آزادی کی تحریک کے نام وقف کردیا۔ آہستہ آہستہ اودھم سنگھ نے انقلابیوں سے تعلقات بڑھانے شروع کردیئے، انقلابیوں کے درمیان وہ قابل قدر نوجوان تھا جس کے دل میں آزادی کی شمع روشن ہوچکی تھی۔

۱۹۲۳ء میں اودھم سنگھ انگلینڈ کے لیے روانہ ہوئے جہاں انھوں نے ہندستانی شہریوں سے رابطہ قائم کیا لیکن کسی بھی طرح کی کامیابی نہیں ملی۔ پانچ سال تک انگلینڈ میں رہنے کے بعد وہ ہندستان واپس چلے آئے۔ واپسی میں انھوں نے سوچا کہ یہاں سے ایک پستول خریدا جائے۔ وہ پستول لے کر ہندستان آئے تو برطانوی حکومت نے اُنھیں پکڑ لیا۔ ان پر مقدمہ چلایا گیا، اس مقدمہ میں اُنھیں چار سال کی سزا سنائی گئی۔ اس طرح چار سال جیل کاٹنے کے بعد اُنھیں ۱۹۳۲ء میں رہا کیا گیا۔ اب ان کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت عروج پر پہنچ چکی تھی۔ جنرل ڈائر سے انتقام لینے کا جذبہ اب اور بھی قوی ہوگیا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں پھر وہ غیر ملکی سفر پر چلے گئے۔ اس سفر کے دوران پہلے وہ جرمنی گئے اور وہاں سے انھوں نے لندن کی جانب اپنا رُخ کیا۔ لندن پہنچنے کے بعد ان کے دل و دماغ پر ایک ہی دُھن سوار تھی کہ کس طرح سے سفاک ڈائر سے انتقام لیا جائے۔ ہر وقت اب وہ موقع کی تلاش میں رہنے لگے۔ سات سال کی طویل مدت کے انتظار کے بعد ۱۹۴۰ء میں آخر کار وہ گھڑی آگئی۔ ۱۳/ مارچ ۱۹۴۰ء کو لندن کے کیئنٹین ہال میں ایک بڑی میٹنگ ہونے کا اعلان ہوا۔ اس میٹنگ میں انگریزوں اور ہندستانیوں نے کثیر تعداد میں حصہ لیا۔ اودھم سنگھ کو بھی اس میٹنگ کی خبر مل گئی۔ وہ بہت خوش تھا کیونکہ اسے آج اپنا انتقام پورا کرنے کا موقع ملنے والا تھا۔

اودھم سنگھ نے بہت ہی ہوشیاری اور صفائی کے ساتھ ایک ضخیم کتاب میں کٹنگ کر کے ریوالور رکھنے کی جگہ بنالی تھی اور اس طرح کتاب میں ریوالور چھپا کر وہ حاضرین کی میٹنگ میں شامل ہوگیا تھا۔ کسی کو اس بات کا گمان بھی نہیں تھا کہ آج کیا ہونے والا ہے۔ انگلینڈ کی کئی معزز ہستیوں کے بعد جنرل ڈائر کو تقریر کے لیے اسٹیج پر بلایا گیا۔ اپنی تقریر میں ڈائر نے ہندستانیوں کے خلاف زہر اُگلنا شروع کردیا۔ میٹنگ ہال میں سناٹا تھا۔ سب لوگ ڈائر کی تقریر بہت ہی خاموشی سے سن رہے تھے۔ وہ فخر کے ساتھ جلیانوالا باغ کے خونی حادثہ کا ذکر کررہا تھا۔ وہ یہ بات واضح کرنا چاہتا تھا کہ اس سانحہ سے اس نے آزادی مانگنے والے محبانِ وطن کو مٹا دیا ہے۔ اس نے ہندستان میں برطانوی سرکار کی جڑیں مضبوط کردی ہیں۔ ان جڑوں کو اب کوئی ہلانے والا نہیں ہے اور نہ ہی کوئی برطانوی حکومت سے اب ٹکرانے کی کوشش کرے گا۔

اپنی تقریر ختم کرنے کے بعد جیسے ہی ڈائر اپنی کرسی پر بیٹھنے والا تھا تو اودھم سنگھ نے اپنی ریوالور کی گولیاں ڈائر کی چھاتی پر داغ دیں۔ اسی جگہ پر ڈائر کی موت ہوگئی۔ آج اودھم سنگھ کا انتقام پورا ہوگیا تھا۔ اودھم سنگھ گولی مارنے کے بعد وہاں سے فرار بھی ہوسکتا تھا مگر آزادی کا یہ پروانہ وہیں کھڑا رہا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی دلیری اور بہادری کا یہ ایک ثبوت تھا۔ اس نے یہ ثابت کردیا تھا کہ ایک انقلابی کسی بھی ظالم انگریز کو اسی کے ملک میں آکر فنا کرسکتا ہے۔ سکون کے ساتھ کھڑے ہوئے۔ اودھم سنگھ کو گرفتار کرلیا گیا۔ یہاں بھی اس نے قومی یکجہتی کی ایک مثال قائم کردی جو آج بھی آزاد ہندستان کی قومی تہذیب کا قیمتی اثاثہ ہے۔ اودھم سنگھ کے خلاف برطانوی حکومت نے مقدمہ چلایا۔ اودھم سنگھ ہر پیشی میں اعتماد کے ساتھ حاضر ہوتا رہا۔ کبھی اس کو کسی نے افسردہ نہیں دیکھا، گویا زندگی میں جو اسے کام کرنا تھا اسے کر کے وہ مطمئن ہوگیا تھا۔ اس کا استقلال دیکھ کر انگریز بھی حیران تھے۔

آخر کار تاریخ کا وہ سیاہ دن بھی آ گیا۔ ۵/ جون ۱۹۴۰ء کو لندن کی ایک عدالت نے اسے سزائے موت سنائی۔ اس کے بعد لندن کی پیٹن ولے جیل میں ۳۱/ جولائی ۱۹۴۰ء میں اودھم سنگھ کو پھانسی دے دی گئی۔

اس طرح آزادی کی تحریک کا ایک انقلابی نوجوان اپنی مادرِ وطن کی خاطر شہید ہوگیا۔ مادرِ وطن کی خاطر شہید ہونے والے اس جاں نثار انقلابی کا نام ہندستان کی تاریخ آزادی میں سنہرے الفاظ میں لکھا جاتا ہے۔ آزادی کے پروانے اودھم سنگھ کی پیدائش ۲۶/ دسمبر ۱۸۹۹ء میں پنجاب میں ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام شری ٹہل سنگھ تھا جو ریلوے میں ملازم تھے۔ جب اودھم سنگھ بارہ سال کے تھے تو ان کے والد ٹہل سنگھ بھی اس عالم فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ اب وہ تنہا تھے اور یتیم تھے۔ اس خاندان کے ایک مہربان دوست نے اودھم سنگھ کو امرتسر کے ایک یتیم خانہ میں داخل کرادیا تھا۔ وہیں پر ان کی پرورش ہوئی اور وہیں سے ابتدائی تعلیم بھی۔ شاید وہیں سے اودھم سنگھ نے مادرِ وطن کو آزاد کرانے کا بیڑا اُٹھالیا تھا۔

جولائی ۱۹۴۰ء میں اودھم سنگھ کو انگلینڈ میں پھانسی دی گئی مگر ان کی استھیاں جولائی ۱۹۷۴ء میں بہت کوشش کرنے کے بعد ہندستان منگائی گئیں۔ اب یہ استھیاں ان کے آبائی شہر سنام (پنجاب) میں ان کی یاد میں بنائی گئی ایک سمادھی میں رکھی گئی ہیں۔□□

بقیہ— جمعیۃ علماء ہند اور...

بغاوت قرار دیا اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ حکومت مخالف اس تحریک سے بالکل الگ رہیں۔ چنانچہ مسلم لیگ نے ۱۶ تا ۲۰ر اگست ۱۹۴۲ء کو منعقد ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں تجویز پاس کرتے ہوئے کہا کہ ''آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا یہ اجلاس ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال - جو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ۸ر اگست ۱۹۴۲ء کے بعد کے اجلاس کے فیصلے سے پیدا ہوئی ہے- پر گہری تشویش کا اظہار کرتا ہے اور غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ کانگریس کی تحریک سول نافرمانی ''کھلی بغاوت'' ہے، جس کا مقصد ہندستان پر ہندو بالادستی قائم کرنا ہے۔ اس باعث ملک میں بدامنی اور لاقانونیت کا دورہ ہے، جان و مال کا اتلاف ہو رہا ہے۔

ان حالات میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی گہرے غور وخوض کے بعد مسلمانوں سے کہتی ہے کہ وہ کانگریس کی جاری کردہ تحریک میں کسی قسم کا حصہ نہ لیں اور اپنے معمولات زندگی کو پرامن طور پر جاری رکھیں۔ (انڈین اینول رجسٹر ۱۹۴۲ء، ص ۲۸۳، جلد دوم)، شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری، جلد سوم، ص ۲۹۲)

لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے مسلم لیگ کی اپیل کو مسترد کر دیا اور ہندستان آزاد ہونے تک آزادی کی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر قربانیاں پیش کرتے رہے: ''مگر افسوس! مسلمانوں نے مسٹر جناح کے مشورے کو قبول نہیں کیا؛ بلکہ کانگریس کی امداد کی؛ ورنہ خاموشی اختیار کی۔ بہر حال لیگ نے مسلمانوں کو تحریک سے علاحدہ رکھنے؛ بلکہ طول و عرض ہندستان میں بلوے کرانے کی ترغیب میں کوتاہی نہیں کی۔ مسلمانان ہند نے جس قدر تحریک کا ساتھ دیا، یا خاموشی اختیار کی، وہ جمعیۃ علماء ہند کی جدوجہد کا نتیجہ اور اراکین جمعیۃ علماء ہند کی قربانیوں کی برکت تھی۔'' (شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری، جلد سوم، ص ۲۹۶)

کاش مسلم لیگ اپنے مطالبہ پاکستان پر بضد نہ ہوتی اور مسلمانوں کی طرف سے ہندستان کی آزادی کی متحدہ آواز بن کر جمعیۃ علماء ہند کی ہم نوائی کرتی، تو آج کے ہندستان میں مسلمانوں کے سیاسی، اقتصادی اور مذہبی حالات اس قدر ناگفتہ بہ نہ ہوتے؛ اے کاش!! ◻◻

بقیہ— مجاہد آزادی چودھری ریاست علی...

خدمت میں لگے رہے۔ جب تک ملک آزاد نہیں ہوا انگریزوں کے خلاف سرگرم عمل رہے، کبھی چھپ کر کبھی اعلانیہ بغاوت کے شعلوں کو ہوا دینے میں مصروف رہے۔ ملک کے آزاد ہونے کے بعد سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی۔ جب مجاہد آزادی کو سرکاری پنشن دینے کی اسکیم کے تحت اُن کے پاس کچھ سرگرم نوجوان آئے کہ آپ اپنی درخواست پر دستخط کر دیجیے، آپ کو پنشن مل جائے گی، تو مجھے ان کے وہ جملے آج تک یاد ہیں جو چودھری ریاست علی خاں نے ان سرگرم نوجوانوں سے کہے تھے ''میں نے جو کچھ کیا فرض اور ایمان سمجھ کر اپنے ملک کی آزادی کے لیے کیا، اس کا بدلہ ملکی حکومت سے نہ لے کر خدا ہی سے لوں گا۔''

اسے کوئی نہیں جانتا، یہ شمع آزادی کا پروانہ جس نے قوم و ملک کی خدمت دنیاوی سکھ کے لیے نہیں کی تھی، ۱۹۴۹ء میں مارچ کے مہینے میں ۵۷ سال کی عمر میں ابدی نیند سو گیا اور اپنے آبائی قبرستان میں دادا بہاء الدین کے پہلو میں سپردِ خاک ہوا۔ چودھری سرائے میں واقع قبر پر تاریخ وفات کندہ ہے۔ چودھری ریاست علی خاں کی تین اولادیں ہوئیں: محمد ابوبکر خاں، محمد عمر خاں، بلقیس بیگم۔ بڑے صاحبزادے محمد ابوبکر خاں سنبھل میں مقیم تھے، آج وہ موجود نہیں لیکن ان کی یاد اور کارنامے مشعلِ راہ ہیں۔ ◻◻

بقیہ— منظر پس منظر

پی وغیرہ عہدیداران وی آئی پی زمرے میں آتے ہیں۔ ان کو چیمبر سے نکلنے سے لے کر مقررہ مقام تک جانے اور وہاں سے ان کے دفتر تک آنے کے لئے پولس چاہئے۔ ملک کی سبھی ریاستی دارالحکومتوں میں حکومت اور پورے وزارتی عہدیداروں کا بوجھ ان پر بڑھ جاتا ہے۔ مذکورہ دارالحکومت کی پولس اپنے وی آئی پی وزراء کی سیکورٹی کے لئے پریشان رہتی ہے۔ جہاں ہائی کورٹ ہے وہاں کے جج کی حفاظت کا بوجھ بھی پولس پر بڑھ جاتا ہے۔ ایڈمنسٹریٹیو آفیسر، وزیر، جج، وزیر اعلیٰ، صدر جمہوریہ یا کوئی مخصوص غیر ملکی مہمان آ جائے تو ٹریفک مکمل طور پر بند کر دیا جاتا ہے جس سے آئے دن لوگوں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آخر اس مسئلے کا کوئی حل ہے کہ نہیں۔ اس مسئلے کا حل ضرور ہے اور وہ یہ کہ حکومت ٹریفک کو مکمل طور پر بند نہ کرے بلکہ شاہراہوں کا نصف عوام کے لئے کھلا رکھے تاکہ انہیں روزمرہ کی زندگی میں مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ کیونکہ اگر کسی وی آئی پی کی موت اسی دوران لکھی ہوگی تو لاکھ سیکورٹی کے باوجود اس وی آئی پی کی موت واقع ہو جائے گی۔ کیونکہ قدرت کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے۔ ◻◻

بقیہ: —— گاھے گاھے باز خواں...

بہر حال قاتلوں کو بچانے کے لیے سنگھ پریوار کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے یہ تو ابھی بعد میں ہی معلوم ہوگا مگر محض ۲۳ مقدمات دوبارہ شروع ہونے پر وشو ہندو پریشد اور اس کے سرپرستوں کا یہ حال ہے تو اگر سپریم کورٹ کی ہدایت کے مطابق تمام بند پڑے ہوئے مقدمات کی فائلیں کھول دی گئیں تو اس کا کیا حال ہوگا۔ اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ خون ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا ہے اور گجرات میں فرقہ پرست شرپسندوں نے بے قصور مسلمانوں کا جو خون ناحق بہایا ہے وہ وشو ہندو پریشد اور سنگھ پریوار کے تابوت میں آخری کیل ہی ثابت ہوگا۔ وشو ہندو پریشد اور سنگھ پریوار خواہ مسلمانوں کے بائیکاٹ کی کتنی بھی دھمکیاں کیوں نہ دیں قانون کا ہاتھ ان کے گریبان تک پہنچ چکا ہے اور اب صرف دیکھنا یہ ہے کہ یہ شرپسند قاتل اپنے انجام کو کب پہنچتے ہیں۔

دنیا کا عظیم ترین
سکندر اعظم بھارت میں طاقت کا کیپسول
نیا بھروسہ ایک ھی کیپسول سے زبردست
طاقت و جسمانی کمزوری دور کریں
میڈیکل اسٹور سے خریدیں یا فون کریں:
09212358677, 09015270020

بقیہ— رفیع احمد قدوائی...

سروس کے امتحان کے ذریعے منتخب ہندوستانی ای میل سروس کے افسران کو تربیت فراہم کرنے کا کام سونپا گیا ہے۔ اکیڈمی اس کے ہم منصب کے طور پر انتظامی اور پولیس لال بہادر شاستری اور سردار پٹیل جیسے برسرآوردہ شخصیات کے نام سے منسوب اکیڈمیاں ہی لیگ میں ہے۔

کولکاتا میں ایک اہم سڑک کو ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے اس ہیرو کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ ان کا مجسمہ بھی قوم کے تئیں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھنؤ اور نئی دہلی میں نصب کیا گیا ہے۔ لکھنؤ میں یہ اندرا نگر میں واقع ہے تو دہلی میں زرعی بھون کے احاطے میں ہے۔

ہردوئی کے ایک جونیئر اسکول کو ۱۹۵۸ء میں ترقی دے کر رفیع احمد قدوائی انٹر کالج بنا دیا گیا۔ اس عظیم شخصیت کی وفات ۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۴ء کو ہوئی۔

نئی نسل کو پیغام

رفیع احمد قدوائی انہی مجبور انسانی گروہوں کے لیے جان نچھاور کرنے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ آج کی نسلوں کو تو پتہ بھی نہیں کہ وہ آزادی جس کا خیال سال میں ایک دن ترنگا جھنڈا لہرا کر اور لال قلعہ سے وزیر اعظم کی تقریر اور اس کے بعد کچھ بیہودہ فلمی گانے سن کر ختم ہو جاتا ہے۔ جب یہ آزادی آئی تھی تو دس لاکھ مجبور انسانوں کے خون میں نہا کر اس نے پہلی انگڑائی لی تھی۔ دلّی کا پرانہ قلعہ، جو آجکل جنگلی جانوروں کا عجائب گھر ہے، اُس خونی سال میں ڈارون کے اصلی جانوروں سے پٹا پڑا تھا۔ چند لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اصلی جانور کبھی انسان کہلاتے تھے۔ کون تھے وہ لوگ؟ ارے بھئی وہی جن کے گھر بار لٹ چکے تھے۔

کاروبار برباد کیے جا چکے تھے۔ ناموس اور آبرو کو درندوں نے نکیلے ناخنوں سے نوچ ڈالا تھا۔ تلواروں اور گنڈاسوں سے بدنوں کا قیمہ کرتے ہوئے وحشت کو لمحہ بھر کے لیے شرمندہ ہو جانے کی فرصت نہ تھی۔ اس وقت دلّی میں چند آدمی درندگی کی ہتھ چھٹ فوجوں سے نہتے لڑ رہے تھے۔ دلّی میں اس آدمی کا نام کہیں ابوالکلام آزاد تھا، کہیں حفظ الرحمٰن سیوہاروی، کہیں سبھدرا جوشی، کہیں رفیع احمد قدوائی۔ کانپور میں ایسے ایک آدمی کا نام گرجا شنکر ودیارتھی تھا۔ سہارنپور میں وہ کلکٹر دیال تھا اور الہ آباد میں کہیں پنڈت سندر لال تھا، کہیں رتن لال بنسل۔

آج اگر ان کے یوم پیدائش یا یوم وفات پر چند الفاظ ادا کر کے یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ہم نے ان کی قربانیوں کا صلہ دے دیا جبکہ قدوائی ان ہستیوں میں تھے جنھیں لفظی نہیں عملی صلہ چاہیے تھا اور عملی صلہ یہی ہے کہ ملک کے عوام سے لے کر افسر شاہی اور سیاست داں تک سب ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں اور اگر کوئی وزیر، سیاست داں اپنے دسترخوان پر انواع و اقسام کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے تو پہلے یہ سوچ لے کہ ملک کے عام لوگوں میں کتنوں کو ویسی نعمتیں میسر ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے کہ ان کے ایک رشتہ دار عبدالرحیم ان کے یہاں مہمان آئے۔ جب دسترخوان لگا تو اس پر صرف چاول اور دال تھی۔ مہمان حیرت سے قدوائی صاحب کا منہ دیکھنے لگے کہ ایک وزیر کے دسترخوان پر مہمان کے لیے یہ کھانا۔ اس موقع پر انھوں نے مہمان کو جو جواب دیا وہ انتہائی عبرتناک ہے۔ انھوں نے کہا کہ ''میں اس ملک کا وزیر غذا ہوں، جہاں کروڑوں لوگوں کو یہ چاول اور دال بھی میسر نہیں جو میرے دسترخوان پر تمہارے سامنے رکھا ہے۔ مجھے کیا حق ہے اچھا کھانا کھانے کا! جب تک میں اپنے ملک کے عوام کو دو وقت ایسی معمولی غذا بھی مہیا نہ کر دوں تو مجھے یہ دال چاول کھانے کا حق بھی کہاں ہے؟'' ◻◻

بقیہ— سحبان الہند .....

علمائے ہند کے صدر رہے۔ انقلاب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان اور خاص کر دہلی و پنجاب کے مسلمانوں پر جو کچھ گزری اور اس میں مولانا نے، جو ڈیڑھ دو برس سے اختلاج وغیرہ مہلک امراض میں گرفتار تھے، اور ان کے ساتھ مولانا حفظ الرحمٰن ناظم عمومی جمعیۃ علماء نے جو خدمات انجام دیں وہ ہندوستان کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھی جائیں گی۔

ایک دن یہ افواہ سُنی گئی کہ کوچہ چیلان سے جامع مسجد تک کے علاقے کو مسلمانوں سے خالی کرا لینے کی تیاری مکمل ہوگئی ہے۔ وہ رات سر پر کھڑی تھی جبکہ بلوائی اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے والے تھے۔ مولانا احمد سعید کو یہ پیغام دیا گیا کہ آپ اپنے نیشنلسٹ مسلمانوں کو ساتھ لے کر ہماری حفاظت میں آ جایئے۔ اس کا جو کچھ جواب مریض اختلاج مولانا سعید نے دیا وہ ملا واحدی کے الفاظ میں سینے لکھتے ہیں:

ایک واقعہ تو ایسا ہے کہ شاید وہی نجات کا ذریعہ ہو جائے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء کی ایک بھیانک رات تھی۔ کرفیو کے باوجود کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ اور پکارا واحدی صاحب! میں مکان کی دوسری چھت میں تھا جہاں مردانہ تھا۔ میرے بڑے لڑکے مجتبیٰ واحدی نیچے اُترے اور انھوں نے اطلاع دی کہ لالہ دیس راج ہیں۔ دیس راج میونسپل کمیٹی کے ساتھ تھے۔ علاقہ کا مسلمان ممبر میں تھا اور ہندو ممبر وہ۔ میں نے مجتبیٰ سے کہا بلا لو۔ دیس راج صاحب بولے آپ ہی آیئے۔ خیر! میں گیا تو متعدد موٹریں کھڑی تھیں۔ لالہ دیس راج نے کہا کہ یہ مسز کرپلانی ہیں صدر انڈین نیشنل کانگریس کی دھرم پتنی۔ یہ مسٹر شانتی سروپ آہوجہ ہیں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ مسز کرپلانی نے سوال کیا۔ ''اس محلے میں تو امن ہے؟'' میں نے کہا ''ہاں اس محلے میں تو ابھی امن ہے۔ مگر امن ٹوٹنے کا ہر آن امکان ہے۔'' مسٹر آہوجہ بولے۔ ''مہاتما گاندھی کو اطلاع ملی ہے کہ یہاں خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے۔ آپ صاف صاف بتایئے کہ خطرے کا ''وہم'' کیوں ہے؟ مسز کرپلانی مہاتما جی سے کیا کہیں؟ میں نے کہا ''برابر کے محلے زد میں آ چکے ہیں اس وجہ سے اطمینان نہیں ہے۔ مولانا احمد سعید صاحب کا گھر قریب ہے ان سے اور پوچھ لیجیے۔ ممکن ہے کہ وہ کچھ اور زیادہ بتا سکیں۔'' چنانچہ مولانا سے پوچھا گیا۔ انھوں نے بھی وہی فرمایا جو میں نے کہا تھا۔ صرف اتنا اضافہ کر دیا کہ ''مسٹر آصف علی اور مفتی کفایت اللہ کا محلّہ آپ کے انتظامات کا منتظر ہے۔'' آہوجہ صاحب نے کہا۔ ''آپ اور آپ کے ساتھی ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں چلے جائیں۔ وہ خالی ہے۔ وہاں مطلق خطرہ نہ رہے گا۔ کوٹھی کی حفاظت محلّے کی حفاظت کی نسبت آسان ہے۔'' مولانا نے فرمایا۔ ''محض اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان بچانی کونسی اچھی بات ہے۔ آپ بچا سکتے ہیں تو محلے کے نہیں شہر بھر کے مسلمانوں کو بچائیں آج کل ساتھی اور غیر ساتھی کا فرق محال ہے۔''

۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن، حافظ عزیز حسن بقائی، اور جعفری صاحب کا وفد روزانہ مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت نہرو، مہاتما گاندھی کے پاس جایا کرتا تھا۔ جو تینوں کو بتایا کرتا تھا کہ مسلمانوں پر کل کیا گزری۔ ایک دن گاندھی جی مسلمانوں کے پاس تشریف لے آئے۔ کونے کونے کے مسلمان سمٹ کر مولانا احمد سعید کے علاقے میں جمع ہو چکے تھے۔ دلّی کے اور محلے مسلمانوں سے تقریباً خالی تھے۔ مہاتما جی کا جلسہ مسٹر آصف علی والے مکان کوچہ چیلان میں منعقد کیا گیا۔ مولانا احمد سعید نے تقریر شروع فرمائی۔ دو چار لفظ بولے ہوں گے کہ لفظوں کی جگہ آنسو بہنے لگے۔ اور مولانا کی جگہ مولانا محمد حفظ الرحمٰن نے تقریر کی تکمیل فرمائی۔ میرا خیال ہے کہ انقلاب ۱۹۴۷ء سے جس قدر مولانا متاثر ہوئے۔ اس قدر شاید کوئی متاثر نہیں ہوا۔ گاندھی جی کی قیام گاہوں تک کا بلاناغہ سفر کتنا خطرناک تھا۔ پھر گاندھی جی سے شکایت کرنا معمولی حکام کو ہی نہیں۔ سردار پٹیل وزیر داخلہ کو بھی دُشمن بنانا تھا۔ پٹیل صاحب گاندھی جی سے خفا ہونے کی طاقت اور ہمت نہ رکھتے تھے۔ (الجمعیۃ مورخہ ۱۴ر دسمبر ۱۹۵۹ء)

۱۹۴۷ء سے زندگی کے آخری لمحات تک عوام کے کاموں اور سفارشوں کے لیے دوڑ دوڑ کر حکام اور وزراء کے پاس جانا اور اپنے امراض کی پروانہ کرنا۔ ان خدمات کے ساتھ علمی مشاغل مثلاً تصنیف و ترجمہ کا جاری رکھنا، معمولی بات نہیں ہے۔ اس سراسیمگی اور بدحواسی کے دور نامسعود میں خداوند عالم نے جن کو استقامت کی توفیق بخشی وہ جمعیۃ علمائے ہند کے حضرات تھے۔ خداوند ذوالجلال نے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم عمومی جمعیۃ علمائے ہند کو وہ جرأت و ہمت اور وہ استقلال عطا فرمایا جو ایسے موقعوں پر تاریخ کی ممتاز شخصیتوں کا قدرتی حصہ ہوتا ہے۔ ان کی رفاقت میں حضرت مولانا احمد سعید صاحب جو پانچ چھ سال سے اختلاج قلب وغیرہ میں مبتلا تھے اور ضعف و نقاہت نے ایک حد تک گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا تھا۔ ہمت مردانہ کے ساتھ اٹھے اور کوہ استقلال بن کر کارکنان جمعیۃ کی بزرگانہ سرپرستی فرمائی۔ اب یا تو مرض ہی نہ رہا تھا یا احساسِ مرض مفقود ہو گیا تھا۔ ان حضرات کے استقلال و استقامت نے جماعت کے کارکنوں میں نئی زندگی پیدا کر دی۔ ان کے حوصلے بلند ہو گئے۔ اور انھوں نے سر ہتھیلی پر رکھ کر وہ خدمات انجام دیں جو مسلمانان دہلی کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیں گی۔

حضرت مفتی اعظمؒ کے مرض وفات میں مدرسہ امینیہ کی ضروری میٹنگ مورخہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو مکان پر منعقد ہوئی۔ آئندہ کے انتظامات کے سلسلے میں اہم غور و خوض کرنا تھا۔ حضرت مفتی اعظمؒ نے صراحتاً کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا تھا۔ یہ معاملہ مجلس کے زیر غور تھا کہ مدرسے کا انتظام کس کے سپرد کیا جائے۔

مولانا فرمایا کرتے تھے کہ ''بھئی میں نے کبھی کسی بات پر فخر نہیں کیا۔ لیکن اس بات پر مجھے فخر ہے اور ہمیشہ اس کی مسرت رہے گی کہ حضرت مفتی صاحب نے اپنے آخری لمحات تک مجھ پر اعتماد فرمایا۔ یعنی جب مجلس کے ارکان نے حضرت سے اس بارے میں کچھ ارشاد فرمانے کی اور اپنا خیال ظاہر فرمانے کی خواہش کی تو حضرت نے زبان سے کچھ نہیں فرمایا اور میری طرف اشارہ کر دیا۔'' چونکہ بطور دور اندیشی کے یہ امر زیر غور لایا گیا تھا اس لیے عارضی طور پر چیکوں کے اوپر دستخط کرنے کا اختیار حکیم شریف الدین صاحب بقائی کو دے کر جلسے کو ملتوی کر دیا گیا اور ان کی وفات کے بعد مورخہ ۱۳ر جنوری ۱۹۵۳ء کے جلسے میں مولانا کو مدرسے کا مہتمم اور راقم الحروف کو نائب مہتمم بنایا گیا۔ آپ نے انکار فرمایا لیکن حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد نور اللہ مرقدہٗ کے شدید اصرار پر کچھ عرصے کے لیے آپ نے اعزازی عہدۂ اہتمام قبول کیا۔ اور تقریباً دو ڈھائی سال کے بعد راقم الحروف کی عزت افزائی فرما کر خود مستعفی ہو گئے۔

آپ کو عہد جوانی میں مرض سل لاحق ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے آپ کو تقریر کرنے سے منع کیا تھا۔ اُس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر بھی نہیں آیا تھا۔ بولنے میں قوت بھی زیادہ صرف ہوتی تھی۔ مگر عمر بھر تقریریں کرتے رہے اور خوب تندرست رہے۔ بڑھاپے کا دور شروع ہونے پر غالباً پرانا مرض جاتا رہا تھا۔ مگر دوسرے امراض نے آ گھیرا تھا۔ اکثر اختلاج وغیرہ کی شکایت رہتی تھی۔ ۱۹۴۵ء سے آپ بہت زیادہ نحیف ہو گئے تھے۔ وفات سے دو تین برس قبل سب ڈاکٹر کہتے تھے کہ تعجب ہے کہ مولوی جی زندہ کیونکر ہیں۔ ان کا دل تو جواب دے چکا ہے۔ انھیں میں سے بعض یہ کہتے تھے کہ مولوی جی کو تو غریبوں کی دعاؤں نے روک رکھا ہے۔ غرض کہ دو تین برس سے دل کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ مگر خدمت خلق میں کوتاہی نہ ہوتی تھی۔ مورخہ ۴ر دسمبر ۱۹۵۹ء مطابق ۳ر جمادی الثانی ۱۳۷۹ھ بروز جمعہ بعد مغرب حرکت قلب بند ہو گئی۔ اور وہ بلبل ہزار داستان جس کی شیریں بیانی کا نصف صدی تک ڈنکا بجتا رہا سات بج کر دس منٹ پر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ اور کتاب اللہ کا وہ نقیب جس نے عمر بھر اللہ کی مخلوق کو اس کی آیات کا مفہوم سمجھایا دائمی نیند سو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ◻◻

لوجہاد مخالف قانون کے خلاف جمعیۃ علماء ہند کی عرضی پر گجرات ہائی کورٹ نے سرکار سے پوچھے کئی سوالات

آئین کی بنیادی دفعات اور انسانی حقوق کو کچلنے والا قانون منظور نہیں: مولانا محمود مدنی

نئی دہلی ۷/اگست: مفروضہ لوجہاد کا فتنہ کھڑا کرکے گجرات سرکار نے ۱۵/جولائی کو 'مذہبی آزادی (ترمیم شدہ) ایکٹ ۲۰۲۱ء' نافذ کیا تھا، اس کے بعد بہت سارے لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے اور متعدد ایف آئی آر درج کی گئی ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند و دیگر کی طرف سے گجرات ہائی کورٹ میں اس قانون کے خلاف ایک ہفتہ قبل ایک عرضی داخل کی گئی تھی۔ جمعرات کو گجرات ہائی کورٹ نے اس سلسلے میں ریاستی سرکار (ایڈوکیٹ جنرل) کو نوٹس جاری کیا ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے ایڈوکیٹ آن ریکارڈ محمد عیسیٰ حکیم اور سینئر وکیل مہر جوشی ہیں۔ جسٹس وکرم ناتھ اور جسٹس ویرن وشنو کی دورکنی بنچ نے حکومت کو نوٹس جاری کرتے ہوئے اس طرح کے قانون بنانے کا مقصد پوچھا ہے اور تفتیش کیا کہ اگر آپ کہتے ہیں کہ شادی زبردستی ہوئی ہے یا دھوکہ سے ہوئی ہے، تو مان لیا یہ جرم ہے، لیکن اگر آپ کہتے ہیں کہ شادی کی وجہ سے کسی شخص نے مذہب بدلا ہے، اس لیے جرم ہے، تو بتائیں وہ کیسے جرم ہے؟ یہ سوال درحقیقت عدالت نے قانون کی شق ۳ میں 'شادی کی وجہ سے تبدیلی مذہب' والے جملے کی روشنی میں کیا۔ عدالت نے ایک سوال یہ بھی پوچھا: اگر کوئی شادی کرتا ہے تو کیا آپ اسے جیل بھیجیں گے اور پھر اطمینان حاصل کریں گے کہ شادی زبردستی کی گئی تھی یا لالچ میں؟ اس پر حکومت کی طرف سے عدالت میں موجود شری لوکمار نے جواب دینے کے لیے وقت طلب کیا اور کہا کہ اس سے قبل قانون کا مکمل مطالعہ ضروری ہے۔

جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے دائر کردہ عرضی میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ اس قانون کے غلط استعمال ہونے کا صد فی صد خطرہ ہے، اس کے اندر 'لالچ دے کر تبدیلی مذہب کو جرم قرار دیا گیا ہے، اور لفظ 'لالچ' کی تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ ہر طرح کا قدم جرم مانا جائے گا، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص کسی کو مذہب قبول کرنے کے تناظر میں ''خدا کی رضامندی، ناراضی اور بہتر زندگی'' کی بات کہے (لالچ دے) تو بھی وہ مجرم قرار دیا جائے گا اور اسے لالچ اور دھوکہ کے زمرے میں رکھا جائے گا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قانون مکمل طور سے مذہبی آزادی کے خلاف ہے اور کسی بھی شخص کو مذہب بدلنے یا مذہب کی دعوت دینے سے صاف طور سے روکتا ہے، جو آئین ہند کی بنیادی دفعہ ۲۵ کو روندنے والا ہے۔

اس سلسلے میں آج نئی دہلی میں جمعیۃ علماء ہند کے قومی صدر مولانا محمود اسعد مدنی نے کہا کہ گجرات میں بنایا گیا قانون آئین کے بنیادی دفعات کے خلاف ہے، ملک چلانے والے کو قانون بنانے کا حق ہے، لیکن انسانی حقوق، شخصی آزادی اور آئین کے بنیادی دفعات کو کچلنے والا قانون ملک سے محبت کرنے والے کسی بھی طبقے کو منظور نہیں ہوسکتا۔

واضح ہو کہ جمعیۃ علماء گجرات کے ناظم پروفیسر نثار احمد انصاری اور مائناریٹی کوآرڈی نیشن کے کنوینر مجاہد نفیس اس مقدمہ کی نگرانی کررہے ہیں، اس سے قبل بھی جمعیۃ علماء گجرات نے لینڈ ڈسٹربڈ ایریا ایکٹ کے خلاف ہائی کورٹ میں عرضی داخل کی تھی۔

سہواپور میں جمعیۃ علماء ہند کی انتخابی میٹنگ کا انعقاد

مورخہ ۸/اگست ۲۰۲۱ بروز اتوار جمعیۃ علماء ہند تحصیل مہولی و مسرکھ ضلع سیتاپور کی ایک انتخابی میٹنگ بمقام مسجد سہواپور جناب حکیم جمیل احمد صاحب اور جناب حکیم ظہیر احمد صاحب کی سرپرستی میں منعقد ہوئی جس میں مہمان خصوصی کے طور پر ضلعی یونٹ کے ذمہ داران شریک ہوئے جس میں ضلع صدر جناب مست حفیظ رحمانی صاحب اور شہر صدر جناب ڈاکٹر مفتی محمد وسیم ندوی صاحب، نائب ضلع سکریٹری مولانا متین مظاہری، نائب صدر جناب مولانا حسام الدین صاحب قاسمی، شہری یونٹ نائب صدر مولانا جمال احمد قاسمی، ماسٹر وصی الحق اور ماسٹر شاہد عثمانی صاحب شریک ہوئے، جن کی موجودگی میں باالاتفاق رائے درج ذیل حضرات منتخب ہوے: صدر: مولانا عزیز وارث ندوی، نائب صدور: جناب حکیم مشیر احمد مظاہری، جناب حکیم جلیل احمد قاسمی، مولانا معین الدین مظاہری مولانا، معین الحق ندوی، حافظ طالب صاحب۔ سکریٹری: مولانا زبیر ندوی، نائب سکریٹری: ڈاکٹر مولانا نفیس احمد ندوی، خزانچی: حافظ عتیق صاحب۔ ممبران: جناب حکیم انیس احمد صاحب، قاری محمد سالم، محمد نعمان باندوی، مولانا سلیم باندوی، مولانا ہارون مظاہری، مولانا خالد قاسمی، مولانا جاوید ندوی۔

اس موقع پر پروگرام کا آغاز معین الحق ندوی کی تلاوت سے ہوا اور نعت پاک محمد عاصم نے پیش کی اور نظامت کے فرائض مفتی محمد وسیم ندوی نے انجام دیئے۔ اس پروگرام میں تحصیل مہولی و مسرکھ کے علماء وعوام نے بڑی تعداد میں شرکت کی، ساتھ میں شجرکاری بھی کی گئی۔

جنتر منتر پر مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیزی کرنے والوں پر سخت کارروائی کی جائے

صدر جمعیۃ علماء ہند مولانا محمود مدنی نے وزیر داخلہ حکومت ہند اور دہلی پولیس کمشنر کو مکتوب ارسال کیا، اس سلسلے میں

نئی دہلی ۹/اگست: ملک کی راجدھانی دہلی کے قلب میں واقع جنتر منتر پر مسلمانوں کے خلاف کھلے عام اشتعال انگیزی کی گئی، یہ بھارت بچاؤ ابھیان ریلی کے مظاہرین کے ایک گروہ نے انجام دیا، جب اس کا ویڈیو منظر عام پر آیا تو ملک میں بے چینی پھیل گئی۔ اس سلسلے میں آج جمعیۃ علماء ہند کے قومی صدر مولانا محمود مدنی نے وزیر داخلہ حکومت ہند امت شاہ اور دہلی پولس کمشنر کو خط ارسال کیا ہے۔ اس خط کی ایک کاپی جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری مولانا حکیم الدین قاسمی کی قیادت میں ایک وفد نے جنتر منتر پر واقع پولیس کیمپ میں پہنچ کر نئی دہلی رینج کے جوائنٹ کمشنر شری جسپال سنگھ اور ڈی سی پی شری دیپک یادو سے ملاقات کرکے بھی سونپا۔

مکتوب میں کہا گیا ہے کہ ویڈیو میں کھلے عام مسلمانوں کے قتل عام کی دھمکی دی گئی ہے جو سوشل میڈیا پر بڑی تیزی کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ اس سے ملک کے امن پسند افراد اور مسلم اقلیت کو سخت تکلیف پہنچی ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ ایسے عناصر کے خلاف جلد کارروائی عمل میں لائی جائے اور ان پر دو فرقوں کے مابین نفرت پھیلانے والے دفعات لگائے جائیں۔ صدر جمعیۃ علماء ہند نے اپنے مکتوب میں دہلی میں فرقہ وارانہ صورت حال پر بھی تشویش کا اظہار کیا ہے اور ۲۰۲۰ء کے حالات دوبارہ دوہرائے جانے سے خبردار کیا ہے۔ اس لیے پولس انتظامیہ کو چوکس کیا جائے اور زہریلے بیانات دینے والے گروہ اور کے سرغنہ کو گرفتار کیا جائے۔ جمعیۃ علماء ہند، دہلی پولس کمشنر کے اس بیان کو تعریف کی نگاہ سے دیکھتی ہے جس میں انھوں نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو اپنی ترجیحات میں سرفہرست رکھا ہے، لیکن محض بیان کافی نہیں ہے، بلکہ نفرت کی جڑ کو ختم کرنے کی ضرورت ہے جو ملک کی راجدھانی میں ایسی حرکتیں انجام دے رہی ہے، اس کی وجہ سے بین الاقوامی سطح پر ملک بدنام ہورہا ہے۔ جنتر منتر پر جوائنٹ پولیس کمشنر اور ڈی سی پی سے ملاقات کے وقت بھی وفد نے اسی طرح کے خیالات پر گفتگو کی اور امید کا اظہار کیا کہ پولیس ان عناصر کو کیفر کردار تک پہنچائے گی، جوائنٹ کمشنر نے وفد کو یقین دلایا کہ سخت سے سخت کارروائی عمل میں لائی جائے گی، ابھی فی الوقت اس ویڈیو کے سبھی پہلو کا جائزہ لیا جارہا ہے، نیز ایسے افراد پر ایف آئی آر درج کرلی گئی ہے۔

جمعیۃ کے وفد میں جنرل سکریٹری مولانا حکیم الدین قاسمی کے علاوہ جناب محمد مبشر کارکن دفتر جمعیۃ علماء ہند اور مولانا عظیم اللہ صدیقی بھی شامل تھے۔

مولانا عبد الخالق سنبھلی کے انتقال پر خانقاہ رحمانی کے سجادہ نشین کا اظہار غم

مونگیر۲/اگست ۲۰۲۱ء: دارالعلوم دیوبند کے استاذ اور نائب مہتمم حضرت مولانا عبد الخالق سنبھلی کے انتقال پر خانقاہ رحمانی مونگیر کے سجادہ نشیں حضرت مولانا احمد ولی فیصل رحمانی صاحب نے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت نے دین اور علم کی برسوں خدمت کی، وہ تین نسلوں کے استاذ تھے، کئی سالوں سے اہتمام کے کام کو بھی سلیقہ سے دیکھتے رہے، اللہ تعالیٰ نے بڑی صلاحیتوں سے نوازا تھا، بڑے نرم دل تھے، اور اپنی نرم دلی اور شفقت کی وجہ سے لوگوں میں مقبول تھے، اللہ تعالیٰ نے ان سے بڑا کام لیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں رکھے، پسماندگان کو صبر جمیل دے اور دارالعلوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے (آمین) جامعہ رحمانی میں ان کے انتقال کی خبر سے غم کی لہر دوڑ گئی، اساتذہ جامعہ رحمانی نے ان کے لیے مغفرت کی دعاء کی، اور ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔

مولانا عبدالخالق سنبھلی کے انتقال پر جامعہ مدنیہ سبل پور میں تعزیتی نشست

دارالعلوم دیوبند کے بہت ہی مقبول استاذ اور نائب مہتمم مولانا عبدالخالق سنبھلی صاحب اس دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے، خبر ملتے ہی جامعہ مدنیہ سبل پور، پٹنہ میں تعزیتی نشست اور دعائیہ مجلس کا انعقاد ہوا، تعزیتی نشست کی صدارت جامعہ مدنیہ سبل پور، پٹنہ کے مہتمم جناب مولانا محمد حارث بن مولانا محمد قاسم صاحب نے فرمائی، جامعہ مدنیہ سبل پور، پٹنہ کے معاون مہتمم جناب مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب، مولانا منہاج الدین، مفتی عبدالاحد، مفتی خالد انور پورنوی، مفتی محمد اکرم، مفتی احمد علی، حافظ نجم الہدی، مولانا نورالزماں، مولانا محمد صالح، مولانا سہیل اختر مظفرپوری، مولانا عبدالرحمٰن، مولانا فیاض احمد، مولانا محمد اکبر، مولانا عمر فاروق شریک ہوئے۔ حضرت مولانا عبدالخالق صاحب ایک مؤقر عالمِ دین، بہترین ادیب، اور باکمال استاذ تھے، سادگی میں اپنی مثال آپ تھے، ان کے یہاں بڑوں اور بچوں والی کوئی بات نہیں تھی، ہر کوئی بے تکلف ان سے مل سکتا تھا، اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ وہ جامعہ مدنیہ سبل پور، پٹنہ بھی تشریف لا چکے ہیں، اس موقع پر ان کا اہم خطاب بھی ہوا تھا، جناب مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کی رقت آمیز دعاء پر مجلس اختتام پذیر ہوئی۔

مراسلات

ادارہ کا مراسلہ نگار کی رائے سے اتفاق ضروری نہیں

نو مسلموں کا جذبہ ایمانی

ننانوے فیصد مسلمان خاندانی یا پیدائشی مسلمان ہیں، ان کے باپ دادا مسلمان ہیں یا تھے اس لیے وہ بھی مسلمان ہیں۔ بائی چوائز مسلمان ایک فیصد سے بھی کم ہیں۔ جو لوگ اپنے کسی دوست یا پڑوسی سے یا قرآن مجید و سیرتِ رسولؐ یا اسلامی لٹریچر پڑھ کر یا متاثر ہو کر اسلام قبول کرتے ہیں وہ اپنے پرانے اور نئے مذہب کا موازنہ کرتے ہیں تو اسلام کی حقانیت ان پر کھل کر سامنے آتی ہے پھر افراد سے یا کتابیں پڑھ کر اسلام کو مزید سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اسلام پر ان کا یقین اور پختہ ہوتا ہے۔ نسلی یا پیدائشی مسلمان بہت کم علمی طور پر اسلام سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں زیادہ تر سنی سنائی باتوں پر یقین کرتے ہیں یا اس کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ ان میں اسلام کے لیے مرنے کا جذبہ ہوتا ہے قرآن مجید یا اللہ کے رسولؐ کے خلاف کسی قسم کی گستاخی بھی برداشت نہیں کرتے مگر اسلام کے مطابق یا اللہ و رسولؐ کے احکامات کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ان میں اسلام کی قدر و قیمت بھی نہیں ہوتی جس کی وجہ اسلام کی تبلیغ واشاعت کا جذبہ سرد ہوتا ہے لیکن نو مسلموں میں جذبہ ایمانی بھی زیادہ ہوتا ہے اور تبلیغ واشاعت کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں۔ اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کا جذبہ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ میرے پاس دیپک گھوش آتے تھے میرے ایک دوست نے انہیں قرآن مجید مطالعہ کے لیے دیا تھا میں نے بھی ایک دو کتابیں پڑھنے کے لیے دی تھیں وہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تھے ایک کالج میں پروفیسر رہ چکے تھے۔ بیوی عیسائی مذہب سے تعلق رکھتی تھی خود اور ان کی ماں ہندو تھے۔ ایک روز وہ میری دکان میں آئے کہنے لگے میں اسلام مذہب قبول کرنا چاہتا ہوں میں نے کہا اس قدر جلدی کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ وہ اسلام سے واقف ہوچکے ہیں تاخیر نہیں کرنا چاہتے ہیں موت و زندگی کا کوئی ٹھیک نہیں ہے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ دیپک صاحب آپ کے اندر اسلام قبول کرنے کا جذبہ کیسے پیدا ہوا انہوں نے کہا کہ قرآن مجید نے میرے اندر ایمانی جذبہ پیدا کیا، قرآن جب میں پڑھ رہا تھا تو ذالکتاب لاریب فیہ (یہ اللہ کی کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں) پڑھتے ہی میرے ذہن میں خیال آیا کہ یہ دعویٰ تو کسی اور کتاب میں نہیں ہے۔ اس جملے نے مجھے پوری کتاب پڑھا دی میں جیسے جیسے یہ کتاب پڑھتا گیا میرا ایمان بڑھتا گیا۔ مجھے یقین کامل ہوگیا کہ واقعی یہ اللہ کی کتاب ہے۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا افطار پارٹی میں انہیں دعوت دی وہیں وہ کلمہ شہادت پڑھ کر دیپک گھوش سے عبدالرحمٰن ہوگئے۔ ان کی ماں نے ایک روز ان کی بیوی سے دریافت کیا کہ دیپک روزانہ شام کو گھر سے نکلتا ہے آٹھ نو بجے آتا ہے۔ عبدالرحمٰن شام کو اپنے ایک مسلم دوست کے پاس مسلم محلّہ میں نماز پڑھ کر اس کی دکان میں جاتے بات چیت اور تبادلہ خیال کرتے عشا کی نماز ادا کرکے گھر پہنچتے ان کے معمول میں تبدیلی دیکھ کر ماں نے اپنی بہو سے پوچھا۔ بہو نے کہا کہ آپ کا بیٹا اسلام دھرم قبول کرلیا ہے وہ اپنے نئے دوستوں کے پاس جاتا ہے شام اور رات کی عبادت جسے نماز کہتے ہیں ادا کرکے آتا ہے ماں نے کہا بہت اچھا مذہب ہے بیٹا میرا پہلے سے اچھا ہوگیا اس نے شراب پینا چھوڑ دیا مجھ سے پہلے سے زیادہ اچھا برتاؤ کرتا ہے۔ عبدالرحمٰن نے مجھے بتایا کہ ایک دن صبح سویرے ماں میرے کمرے میں آئی صبح ہونے کی وجہ سے مسلم محلّہ سے آواز میرے گھر تک آتی تھی میری ماں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا دیپک! دیپک اٹھ جاؤ اذان ہو رہی ہے۔

حیدرآباد کے مولانا محمد شریف صاحب نے مجھے بتایا کہ جب وہ آسام میں جماعت اسلامی ہند کے امیر حلقہ تھے تو ایک لڑکا اسلامی لٹریچر پڑھ کر مسلمان ہوگیا ایک دن وہ اپنی بہن کو لے کر آیا کہا کہ مولانا صاحب اسے بھی کلمہ شہادت پڑھا دیجئے میں اور یہ ساتھ اسلام کی تبلیغ کریں گے تو اسلام بہتوں تک جلد پہنچا سکیں گے اکیلے میں کیسے اتنی بڑی آبادی تک اسلام کا پیغام پہنچا سکوں گا۔ شریف صاحب نے کہا کہ میں اس کے جذبہ ایمانی کو دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہ اسلام کا پیغام تیزی سے غیر مسلم بھائیوں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ کسی پرانے مسلمان میں یہ جذبہ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔

داعی اسلام مولانا کلیم الدین صدیقی کے ادارے سے شائع ہونے والا رسالہ 'ارمغان' میں، میں نے ایک واقعہ پڑھا تھا واقعہ مظفرنگر کا تھا۔ ایک مسلمان جو حاجی صاحب کہلاتے تھے دودھ کا کاروبار کرتے تھے ان کے یہاں ایک ہندو نوجوان بھی کام کرتا تھا وہ دین اسلام کی کتابیں پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔ حاجی صاحب اس کے مسلمان ہونے بہت خوش تھے اس نے جب حج کرنے کی خواہش ظاہر کی تو اسے حج کے لیے حج پر جانے والوں کے ساتھ بھیج دیا۔ حج سے جب وہ نوجوان واپس آیا تو حاجی صاحب نے حسب معمول اس سے دودھ میں پانی ڈالنے کیلئے کہا اس نے انکار کردیا حاجی صاحب کے دریافت کرنے سے اس نے کہا کہ 'حاجی صاحب میں نے حج کرلیا ہے اب یہ غلط کام مجھ سے نہیں ہوگا' حاجی صاحب آپے سے باہر ہوگئے کہا 'تم ایک حج کرکے بڑے پارسا بن گئے۔ میاں میں اب تک پانچ بار حج کرچکا ہوں' اگر تم حکم عدولی کروگے تو تم کو نوکری سے نکال دیں گے نوجوان نو مسلم نے کہا 'آپ کی جو مرضی ہو مگر میں غلط کام نہیں کروں گا' حاجی صاحب اپنے ایمان دار نوکر کو برداشت کرنے سے قاصر رہے اسے اپنے یہاں سے نکال باہر کیا، ڈاکٹر ذاکر نائک کے ساتھ حکومت نے جو کچھ کیا وہ اظہر من الشّمس ہے۔ اس کی وجہ واضح تھی کہ ڈاکٹر صاحب کی پرکشش تقریر اور مدلل سوال وجواب سے بہتوں کے دلوں میں تیزی سی تبدیلی آرہی تھی جو فرقہ پرستوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب ملک بدر کردیئے گئے ہیں اللہ ان کو اپنی امان میں رکھے ان کے دشمنوں کی جلد سرکوبی کرے۔

مولانا عمر گوتم نو مسلم ہیں ان سے لوگ متاثر ہوکر حلقہ بگوش اسلام ہورہے تھے اس سے کہیں زیادہ وہ نو مسلموں کے درپیش مسائل حل کرتے تھے۔ جو لوگ ان کے پاس قبول اسلام کے لیے آتے تھے ان کو مزید مطالعہ اور غور وفکر کرنے کیلئے ہدایت کرتے تھے زور زبردستی کا تو کوئی سوال ہی نہیں لالچ دینے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ بی جے پی یا یوگی ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا کے نیک اور اچھے کاموں کو بند کرنا چاہتے ہیں اور دوسرے پولرائزیشن کرکے الیکشن جیتنے کے خواہاں ہیں۔ مولانا اور مفتی جہانگیر قاسمی کو مورد الزام ٹھہرا کر پس زنداں رکھنا چاہتے ہیں۔ غلط الزاموں کی قلعی ایک ایک کرکے کھل رہی ہے جو لوگ مولانا کے رابطے میں تھے یا مولانا جن کی قانونی دستاویزات تیار کرنے میں رہنمائی کی تھی وہ ایک ایک کر کے دنیا کو بتا رہے کہ مولانا نے کبھی نہ انہیں قبول اسلام کیلئے کسی قسم کا دباؤ ڈالا اور نہ ہی حرص اور لالچ دی۔ مولانا نے ہمیشہ غور وفکر سے کام لینے پر زور دیا۔ سب نے یہی کہا خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں، مرد ہوں یا خواتین کہ انہوں نے اپنی مرضی سے دین حق قبول کیا ہے۔ نو مسلمین حق گوئی اور بیباکی کا الحمدللہ مظاہرہ کر رہے ہیں۔ مولانا عمر گوتم اور ان کے رفقا کو اللہ صبر و تحمل عطا فرمائے اور اپنی مدد اور جلد نصرت عطا کرے اللہ یقیناً اپنے نیک بندوں کی مدد فرماتا ہے، جو لوگ ایسے نیک دل انسانوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کرتے ہیں اللہ انہیں سخت سے سخت سزا دیتا ہے ایسے لوگ اللہ کی پکڑ سے ہرگز نہیں بچ سکتے ہیں۔

عبدالعزیز کولکاتہ

ALJAMIAT (URDU WEEKLY) NEW DELHI
Publishing Date: 6 August 2021
Postal Registration No. DL(C)-01/1267/2021-23
Posting Days MON. TUE. at N.D.P.S.O. New Delhi
R.N.I. 38985/82

•جمہوری نظام کا تحفظ کیسے ہو؟ •ملک میں سیکولر فکر ونظر کا اتحاد ضروری

•ملک پر بوجھ بن گئے ہیں وی آئی پی

جمہوری نظام کا تحفظ کیسے ہو؟

جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ عوام کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور ان کو وسیع تر اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔لیکن ان اختیارات کے ساتھ ساتھ ذمہ داریوں کا بوجھ کافی بڑھ جاتا ہے۔ عام طور سے غلط فہمی یا ناواقفیت کے باعث یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عوام کے منتخبہ نمائندے یا سیاسی جماعتیں ہی ان کی رہنما ہوتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جمہوری طرز حکومت میں رہنمائی کی ساری ذمہ داری عوام کے سپرد ہوجاتی ہے جو الیکشن کے ذریعہ اپنی رائے کا برملا اظہار کرکے نہ صرف عوامی نمائندگان کو منتخب کرتے ہیں بلکہ خون خرابہ اور درباری سازشوں کے بغیر اقتدار کی منتقلی کا کام بھی بآسانی انجام دے دیتے ہیں۔

لہٰذا الیکشن کو جمہوریت کی مضبوطی اور اس پر اعتماد رکھنے والوں کی کسوٹی بھی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جس کا ماحول جمہوری ہندوستان میں دھیرے دھیرے سرمایہ کی طاقت اور تشدد ولوٹ مار کے عمل دخل سے بگڑتا جارہا ہے اور اس طرح جمہوریت کی صحت کے تمام تر دعووٗں کے باوجود ملک میں جمہوریت کمزور ہورہی ہے۔

جمہوریت ایک واضح اور ٹھوس نظریہ ہے اس میں نہ کسی قسم کا ابہام ہے اور نہ ہی اس میں کسی اور نظریہ کی ملاوٹ کی گنجائش ہے لیکن بدقسمتی سے اس نظریہ پر اقتدار اور اس کے حصول کی ہوس کا جذبہ حاوی ہوتا جارہا ہے۔جن لوگوں نے الیکشن یا اس کے عمل کو جمہوریت کے استحکام کے بجائے صرف اقتدار حاصل کرنے کا زینہ سمجھ لیا ہے یا جن سیاسی پارٹیوں کی پوری توجہ چناؤ کو تجارت بنانے پر مرکوز ہوکر رہ گئی ہے۔آج ہندوستان کی جمہوریت کے وہی سب سے بڑے دشمن ہیں ان کے ذریعہ جمہوریت کی آبیاری کا کام انجام نہیں پارہا بلکہ اس کو نقصان پہنچایا جارہا ہے اور یہ صرف اس لئے ہورہا ہے کہ موجودہ نظام میں اسمبلی یا پارلیمنٹ کے ممبر کو ہی جمہوری نظام کا محافظ سمجھا جانے لگا ہے اور اس نظام کو انگلیوں پر نچانے کا اختیار بھی ان کو ہی دے دیا گیا ہے جو عوام کے ووٹوں سے چن کر قانون سازاداروں میں جاتے ضرور ہیں مگر عوامی مفاد کو ہی سب سے پہلے فراموش کردیتے ہیں۔

اگر ہندوستان کے عوام کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ ان کی مرضی ومنشاء کے بغیر ملک کا کاروبار حکومت نہیں چل سکتا یا ایک بار اپنے نمائندوں کو منتخب کرکے واپس بلانے کا اختیار بھی انہیں مل جائے تو دیش کے بیشتر مسائل آج ہی سلجھ سکتے ہیں، ملک سے بدعنوانی تشدد، فرقہ واریت، اور دیگر ناانصافیوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ اگر عوامی نمائندوں پر عوام کے احتساب کا خوف غالب آجائے۔

جس طرح ایک غافل اور نااہل حکمراں اقتدار سے محروم ہوجاتا ہے اسی طرح اگر عوام غفلت اور لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے رہیں تو جمہوریت کی گاڑی ایک دن پٹری سے اتر جاتی ہے لہٰذا ہندوستان کے ہر شہری کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے نمائندوں پر نظر رکھے ان کو آزاد نہ چھوڑے بلکہ فرض کی ادائیگی اور وعدوں کو پورا کرنے کے لئے تقاضا کرتا رہے اور ان میں ہرگز یہ احساس نہ پیدا ہونے دے کہ وہ عوام کے رہنما ہیں بلکہ ان کو اس حقیقت سے آشنا کرتا رہے کہ عوام ہی ان کے رہنما ہیں۔

کسی شئے کا صحیح اور بہتر استعمال ہی اس کی کامیابی کی دلیل ہوا کرتا ہے اس لئے جمہوریت کی بقاء، یا کامیابی اور اس کی خوبیوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ ہم اپنے نمائندوں کا صحیح اور بہتر مصرف سمجھیں ان کو وہی کام کرنے پر مجبور کریں جو ان کے فرائض میں شامل ہیں اور جن سے ملک اور عوام کو فائدہ پہونچ سکتا ہے اسی طرح ہم جمہوریت کی آبیاری اور ملک وقوم کی ترقی کا کام انجام دے سکتے ہیں لہٰذا آزادی کے ۵۵ سال پورے ہونے کے اس سال کے دوران ہندوستانی عوام کو اس بات کا عہد کرنا چاہئے کہ وہ یہ کام انجام دیں گے۔

ملک میں سیکولر فکر ونظر کا اتحاد ضروری

ہندوستان کے سیکولر ماحول کو صرف ایک مذہبی نظریہ سے مکدر کرنے کی کوشش کے خلاف ملک کے مضبوط سیکولر ذہن کے لیڈر بی جے پی کے خلاف مورچہ بندی کے لئے فکر مند ہیں تو یہ ہندوستان کی اقلیتوں کے لئے ایک اطمینان کا پہلو ہے۔ کیونکہ بی جے پی کے رہنما خود کو ہندوتوا کے علمبردار بنا کر اس ملک کی برسوں پرانی تاریخ کو مسخ کرنے میں مصروف ہیں جبکہ ملک کا سیکولر ذہن ان کی مخالفت میں ہر دم آگے آرہا ہے۔ گزشتہ چند برسوں سے ملک میں جس طرح کا نفرت پر مبنی ماحول بنایا گیا ہے، اس کے آگے ہر متعصب ذہن خوش ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ہندوستان کے عوام کو گمراہ کرنے والی طاقتیں اب تک اپنے مقاصد میں اس لئے کامیاب نہیں ہوپارہی ہیں کہ اس ملک کے دیگر فرقے بھی فرقہ پرستی کے خلاف ہیں۔قوم پرستی کے نام پر فرقہ

> **سوال یہ ہے کہ کیا بی جے پی ہندوازم کو لیز پر لے کر خود کو ہندوتوا کی علمبردار سمجھ رہی ہے جبکہ سدارامیا کی نظر میں تمام مذاہب کی عزت کرنا ہی اصل میں حقیقی ہندوتوا ہے۔ ہم تمام ہندو ہیں لیکن ہمارے لئے تمام مذاہب کا احترام کرنا ضروری ہے۔**

پرستی کو ہوا دینے کے واقعات کے درمیان اگر ہندو رہنما یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں رہنے والا ہر شہری کا ہندو ہونا لازمی نہیں ہے جیسا کہ گزشتہ دنوں آر ایس ایس سربراہ بھاگوت نے یہ شوشہ چھوڑا تھا کہ ہندوستان میں رہنے والا ہر شخص ہندو ہے، اس پر جوابی حملہ کرتے ہوئے سنگھ کے ہی ایک پرانے رفیق گووندا چاریہ نے آر ایس ایس سرسنچالک کی اس نفرت پر مبنی منطق کو مسترد کردیا تھا۔ موہن بھاگوت سے قبل ان کے پیشرو کے سدرشن نے بھی ہندوستان میں رہنے والوں کو ہندو قرار دیا تھا اور یہ بھی ریمارک کیا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی رگوں میں ہندوؤں کا خون دوڑ رہا ہے۔ یہ مذہبی کٹر پسند لوگ اپنی ذہنی اختراع کے ذریعہ غیر اصولی باتیں کرتے ہوئے ہی فرقہ پرستی کو مضبوط بناتے آرہے ہیں۔ وزیر اعلیٰ کرناٹک سدارامیا نے بی جے پی کے ہندوتوا نظریہ پر سوالیہ نشان لگاتے ہوئے صحیح طور پر یہ پوچھا ہے کہ آیا بی جے پی والوں نے ’’ہندوازم‘‘ کو لیز پر لے لیا ہے، کیا صرف بی جے پی لیڈر ہی ہندو ہیں؟ کیا ہم ہندو نہیں ہیں؟ سوال یہ ہے کہ کیا بی جے پی ہندوازم کو لیز پر لے کر خود کو ہندوتوا کی علمبردار سمجھ رہی ہے جبکہ سدارامیا کی نظر میں تمام مذاہب کی عزت کرنا ہی اصل میں حقیقی ہندوتوا ہے۔ ہم تمام ہندو ہیں لیکن ہمارے لئے تمام مذاہب کا احترام کرنا ضروری ہے۔ ہم کو اس حقیقت کا بھی لحاظ کرنا ہوگا کہ ہم تمام ایک جیسے انسان ہیں یہی ہمارا کلچر ہے۔ یہی اصل ہندوتوا ہے۔بی جے پی اور اس کے نام نہاد لیڈر ہندوتوا کو اپنے نظریہ سے پھیلا کر ملک بھر میں نفرت کا ماحول مضبوط بنارہے ہیں۔ جو آگے چل کر خطرناک تباہ کن صورت حال کا باعث ہوسکتا ہے۔ ملک کے سیکولر عوام کو خاص کر اقلیتوں کو چاہئے کہ وہ ملک کے دیگر فرقوں کے وطن اور سیکولر مزاج قائدین اور افراد کو ساتھ لیکر نام نہاد ہندوتوا طاقتوں کے خلاف صف آرا ہوں۔ بی جے پی کرناٹک میں آئندہ اسمبلی انتخابات کی تیاری کے لئے کرناٹک کی سیکولر فضاء کو بگاڑنے کی کوشش کررہی ہے۔ تاکہ وہاں اس کے قدم جم سکیں، کرناٹک کے عوام کو اِسے سمجھ لینا چاہئے۔

ملک پر بوجھ بن گئے ہیں وی آئی پی

ملک میں قانون، نظم ونسق اور اصول وضوابط کی پاسداری کا فقدان ہے۔ اس ملک میں ان شخصیات کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے جو وی آئی پی زمرے میں آتی ہیں۔ان کے لئے مخصوص قسم کی گاڑیاں شاندار رہائشی مکان، نوکر چاکر اور سیکورٹی کا بہت ہی معقول انتظام ہوتا ہے۔ وہ جس گلی، شاہراہ، محلے اور چوراہے سے گزرتے ہیں۔ اُن راہوں پر کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار پاتا ہے اور نہ ہی اُس راستے پر سیکورٹی اہلکاروں کے اور ان کی گاڑیوں کے علاوہ کوئی دوسرا شخص دکھائی دیتا ہے۔ وی آئی پی زمرے والے افراد کو خاص سیکورٹی فراہم کی جاتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ملک میں صرف ان کی ہی جان قیمتی ہے اور دیگر افراد کی حثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ اس ملک میں ۱۶۸۰۰ وی آئی پیز ہیں۔ جن کے لئے ۵۰ ہزار سے زائد سیکورٹی اہلکار تعینات ہیں جبکہ ہر ایک لاکھ کی آبادی کو صرف ۱۳۱ پولس والے میسر ہیں۔ وی آئی پی لوگوں کی وجہ سے ٹریفک نظام تہہ وبالا ہوکر رہ جاتا ہے۔ وی آئی پی افراد کی آمدورفت کی وجہ سے کئی مریض وقت پر ہاسپٹل نہیں پہنچ پاتے ہیں اور ٹریفک میں پھنسے ہونے کی وجہ سے تاخیر سے ہاسپٹل پہنچتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ کیا کوئی اس کا جواب دہ ہے؟ کون ان مریضوں کے افراد خانہ کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہے؟ آخر ٹریفک کو روک کر کسی وی آئی پی کے لئے راہ ہموار کرنا اور اس کی آمدورفت کے لئے راستے خالی کرادینا کہاں کا انصاف ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ جدھر سے وی آئی پی کا قافلہ گزرتا ہے ادھر کے لوگوں کا پورا دن ہی ضائع ہوجاتا ہے۔ کیونکہ وہ ٹریفک مسدودی کی وجہ سے وقت پر اپنی منزل نہیں پہنچ پاتے ہیں جس کی وجہ سے ہزاروں کا نقصان ہوتا ہے۔ سبھی بڑے شہروں میں اس طرح کے حالات کا اکثر وبیشتر لوگوں کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قانون اور نظم ونسق کو بالائے طاق رکھنے کی وجہ سے پولس اسٹیشنوں میں درج معاملات کی بہتر طور پر جانچ نہیں ہوپاتی ہے۔ اسی لئے پولس اسٹیشنوں میں کئی شکایات کو درج کرنے میں کوتاہی برتی جاتی ہے تاکہ ان کی تعداد نہ بڑھیں وہیں دوسری جانب جو درج معاملات ہیں انہیں بروقت عدالت میں پیش نہیں کیا جاتا ہے۔ نظم ونسق میں نقص ہونے اور سیکورٹی عملہ کی کمی کے باعث سب کچھ گڑبڑ ہوجاتا ہے۔ آخر پولس کرے بھی تو کیا کرے؟ دوسری طرف یہ بات بھی دیکھی جاتی ہے کہ ہر معاملے میں تاخیر اور کمی کی اصل وجہ پولس کو قرار دیا جاتا ہے جو درست نہیں ہے۔ ضلع انتظامیہ کے ہیڈ کوارٹرس تک کی بدتر صورت حال ہے۔ وہاں کے کلکٹر، کمشنر، ایس

(بقیہ صـ۱۴ پر)

جمعیۃ علماء اترپردیش کے صدر حضرت مولانا متین الحق اسامہ کانپوری رحؒ کی حیات وخدمات پر مشتمل

ہفت روزہ الجمعیۃ دھلی کی خصوصی اشاعت

مولانا متین الحق اسامہ نمبر

جس میں مولانا قاسمی نوراللہ مقدہ کے احوال زندگی قومی وملّی خدمات
نیز دینی، علمی اور اصلاحی سرگرمیوں کا احاطہ کیا گیا ہے
الجمعیۃ کی ویب سائٹ پر ملاحظہ فرمائیں

رابطہ: ہفت روزہ الجمعیۃ، مدنی ہال (بیسمینٹ) ۱، بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی ۲
موبائل: 09868676489 — ای میل: aljamiatweekly@gmail.com

ضروری اعلان

آپ براہِ کرم مدتِ خریداری ختم ہوتے ہی زرِ سالانہ ارسال فرمائیں۔ خط وکتابت میں خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
ادائیگی کے طریقے: (1) بذریعہ منی آرڈر (2) Paytm یا PhonePe کے ذریعہ 9811198820 پر ALJAMIAT WEEKLY
(3) آن لائن ادائیگی کیلئے بینک اکاؤنٹ کی تفصیل
A/c. 912010065151263
Axis Bank, Branch: Chitranjan Park, N.D.
IFS Code : UTIB0000430

شرح خریداری

سالانہ	200/-
ششماہی	100/-
فی پرچہ	5/-
پاکستان اور بنگلہ دیش کے لئے	2500/-
دیگر ممالک کے لئے	3000/-

رابطہ: منیجر ہفت روزہ الجمعیۃ مدنی ہال (بیسمینٹ) ۱، بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی ۲
فون: 011-23311455

ہفت روزہ الجمعیۃ انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے، لاگ آن کریں: www.aljamiat.in
رابطہ: 9811198820 ای۔میل: aljamiatweekly@gmail.com

Printed & Published by SHAKIL AHMAD SYED on behalf of Jamiat Trust Society printed at Shervani Art Printers, 1480, Qasimjan Street, Ballimaran, Delhi-6 and Published from Madani Hall,1, Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002. Editor MOHD. SALIM, Ph. No. 23311455, 23317729, Fax No: 23316173.
Designing & Composing: HUMRAN AZMI